قرآن حکیم کی فکری و عملی راہنمائی ـــــ درس ۵

# سُورۃُ الفاتحۃ

## قرآن حکیم کے فلسفہ و حکمت کی اساس کامل

ڈاکٹر اسرار احمد

شائع کردہ

مکتبہ خُدّام القرآن لاهور

36-K ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: 35869501-03

www.tanzeem.org

# سُورۃُ الفاتِحۃ

## قرآنِ حکیم کے فلسفہ و حکمت کی اساسِ کامل

نحمدہٗ ونصلی علٰی رَسولہِ الکریم

امَّا بَعد فَاَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجِیمِ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝ مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ ۝ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ۝ اِہۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ ۵ غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ وَلَا الضَّآلِّیۡنَ ۝﴾ (آمین) صدق اللہ العظیم

اللہ تعالیٰ کے نام سے ہم آج کی نشست میں اس سورۃ مبارکہ کے مطالب و مفاہیم سمجھنے کی کوشش کریں گے، جو ہماری نمازوں کا جزوِ لازم ہے اور جس کو خود اللہ تعالیٰ نے ''القرآن العظیم'' سے موسوم فرمایا ہے۔ دین سے ادنیٰ شغف رکھنے والے شخص کو بھی یہ سورۃ مبارکہ لازماً یاد ہوتی ہے۔ تاہم مناسب ہوگا کہ ہم اس سورۃ مبارکہ کے مطالب پر غور کرنے سے قبل اس کا سلیس اردو ترجمہ ذہن نشین کر لیں:

> ''کُل شکر اور کُل ثناء اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا مالک اور پروردگار ہے۔ بہت رحم کرنے والا، نہایت مہربان ہے۔ جزا و سزا کے دن کا مالک و مختار ہے۔ (اے ربّ!) ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے، اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں اور چاہیں گے۔ ہمیں سیدھی راہ کی ہدایت بخش، اُن لوگوں کی راہ کی جن پر تیرا انعام ہوا، جن پر نہ تیرا غضب نازل ہوا اور نہ ہی وہ گمراہ ہوئے''۔ (آمین!)

# چند تمہیدی اور بنیادی باتیں

سب سے پہلے مجھے اس سورۂ مبارکہ کے بارے میں چند تمہیدی اور بنیادی باتیں عرض کرنی ہیں اور اس کے مضامین کا اجمالی تجزیہ پیش کرنا ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ قارئین کرام اِن کو گن کر اچھی طرح ذہن نشین فرمالیں اور انہیں ہمیشہ مستحضر رکھیں۔

## سب سے پہلے نازل ہونے والی مکمل سورت

پہلی بات یہ ہے کہ یہ سب سے پہلی مکمل سورت ہے جو نبی اکرم ﷺ پر نازل ہوئی۔ اس سے قبل متفرق آیات نازل ہوئیں۔ مثلاً وہ پانچ آیات جو سورۃ العلق کے ابتداء میں شامل ہیں۔ اور اس پر تقریباً اجماع ہے کہ وہ سب سے پہلی وحی ہے۔ اکثر محققین کے نزدیک دوسری وحی وہ سات آیات ہیں جو سورۂ ''ن'' (جس کا دوسرا نام سورۃ القلم بھی ہے) کے آغاز میں شامل ہیں۔ تیسری وحی سورۃ المزمل کی ابتدائی سات آیات ہیں اور چوتھی وحی سورۃ المدثر کی ابتدائی سات ہی آیات ہیں' جبکہ پانچویں وحی جو محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی وہ یہ سورۃ الفاتحہ ہے جو پہلی مکمل سورت ہے۔ پھر حسن اتفاق دیکھئے کہ یہ سورۂ مبارکہ بھی سات ہی آیات پر مشتمل ہے۔

## سورۃُ الفاتحہ کی عظمت

دوسری بات اس سورۂ مبارکہ کی عظمت کے بارے میں ہے۔ اس ضمن میں ایک تو خود اللہ تعالیٰ کا اپنا فرمان ہے۔ چنانچہ چودھویں پارے میں سورۃ الحجر میں یہ آیت وارد ہوئی ہے:

﴿وَلَقَدۡ اٰتَیۡنٰکَ سَبۡعًا مِّنَ الۡمَثَانِیۡ وَ الۡقُرۡاٰنَ الۡعَظِیۡمَ ﴿۸۷﴾﴾

''اور (اے نبیؐ!) بے شک ہم نے آپؐ کو عطا فرمائی ہیں سات دہرائی جانے والیاں (یعنی وہ سات آیات جو بار بار پڑھی جاتی ہیں' نماز کی ہر رکعت میں ان کا اعادہ ہوتا ہے) اور قرآنِ عظیم (عطا فرمایا)''۔

اس آیت کے بارے میں مفسرین کا تقریباً اجماع ہے کہ ''سَبۡعًا مِّنَ الۡمَثَانِیۡ'' سے مراد بھی سورۃ الفاتحہ کی سات آیات ہیں اور ''القُرآنُ العَظِیم'' بھی اسی سورۂ مبارکہ کو قرار دیا گیا ہے۔ گویا اس سورۂ مبارکہ کی عظمت یہ ہے کہ یہ بجائے خود ایک مکمل قرآن ہے' اور نہ صرف قرآن بلکہ ''قرآنِ عظیم'' ہے۔ سورۃ الحجر کا وہ مقام جس میں یہ آیۂ مبارکہ وارد ہوئی ہے' وہ ہے جہاں اللہ تعالیٰ نبی اکرم ﷺ کو صبر کی تلقین فرما رہے ہیں اور ساتھ ہی اپنا یہ احسان اور فضل بھی بیان فرما رہے ہیں کہ اے نبیؐ! ہم نے آپ کو اتنی بڑی نعمت عطا فرمائی ہے جتنی بڑی نعمت کسی اور کو نہیں دی' اور وہ ہے سورۃ الفاتحہ۔

اس سورۂ مبارکہ کی عظمت ایک حدیثِ رسولؐ سے مزید نکھر کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ کے بارے میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((اَقْرَؤُهُمْ اُبَیُّ بْنُ کَعْبٍ)) ''صحابہ رضی اللہ عنہم میں قرآن کے سب سے بڑے قاری (عالم) اُبی بن کعب ہیں''۔ ان سے ایک بار خود نبی اکرم ﷺ نے سوال کیا کہ ''اے اُبی! کیا میں تمہیں وہ سورت تلقین کروں جس کی مثل نہ تورات میں نازل ہوئی' نہ انجیل میں' نہ زبور میں اور نہ ہی قرآن مجید میں؟'' جواب میں حضرت اُبی بن کعبؓ نے سراپا اشتیاق بن کر عرض کیا: ''حضور ﷺ ضرور تلقین فرمائیے''۔ اس پر نبی اکرم ﷺ نے دوسرا سوال کیا: ''تم نماز میں کیا پڑھتے ہو؟'' حضرت اُبیؓ نے جواب میں سورۃ الفاتحہ کی تلاوت شروع کر دی تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''اُس ذات کی قسم جس کے دست قدرت میں میری جان ہے' یہی ہے وہ سورت جس کی مثل نہ تورات میں نازل ہوئی' نہ انجیل میں' نہ زبور میں اور نہ ہی قرآن میں اس کی مثل و نظیر موجود ہے' اور یہی سَبۡعٌ مِّنَ الۡمَثَانِیۡ اور قرآن عظیم ہے جو مجھے عطا کیا گیا ہے!''(۱)

(۱) سنن الترمذی' کتاب فضائل القرآن' باب ما جاء فی فضل فاتحة الکتاب۔ اس مضمون کی متعدد احادیث صحیح بخاری میں بھی موجود ہیں۔ دیکھئے: صحیح البخاری' کتاب تفسیر القرآن' باب قوله وَلَقَدۡ اٰتَیۡنٰکَ سَبۡعًا مِّنَ الۡمَثَانِیۡ وَالۡقُرۡاٰنَ الۡعَظِیۡمَ اور دیگر ابواب۔ عن ابی سعید بن المعلّٰی۔

## سورۃ الفاتحہ کے عظیم نام

تیسری بات اس سورۂ مبارکہ کے ناموں سے متعلق ہے۔ اس کا سب سے زیادہ مشہور و معروف اور زبان زدِ خاص و عام نام ''الفاتحۃ'' ہے جو ''ف ت ح'' مادہ سے بنا ہے۔ ''فَتَحَ یَفْتَحُ'' کے معنی ہیں کسی چیز کو کھولنا۔ لہٰذا ''الفاتحہ'' کے معنی ہوئے ''قرآن مجید کی افتتاحی سورت''۔ یہ نام گویا اس اعتبار سے ہے کہ یہ مصحف کی پہلی سورت ہے۔ سب جانتے ہیں کہ عربوں کا یہ خاص مزاج ہے کہ جس چیز سے انہیں خصوصی محبت ہوتی ہے وہ اس کے نام کثرت سے رکھتے ہیں۔ چنانچہ اس سورۂ مبارکہ کے بھی بہت سے نام ملیں گے۔ اس کی عظمت کے اعتبار سے اسے ''اُمّ القرآن'' اور ''اساس القرآن'' بھی کہا گیا ہے۔ گویا یہ سورۂ مبارکہ قرآن مجید کے لیے جڑ' بنیاد اور اساس کے مرتبے اور مقام کی حامل سورت ہے۔ سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کے درس میں بیان کیا گیا تھا کہ قرآن حکیم کی اپنی ایک حکمت اور اس کا اپنا ایک جداگانہ فلسفہ ہے۔ چنانچہ حکمتِ قرآنی کے لبّ لباب' اس کے جوہر' اس کے خلاصے اور قرآن حکیم کے طرزِ استدلال کے اعتبار سے بھی اس سورۂ مبارکہ کو اساسی اہمیت حاصل ہے۔ اس سورۂ مبارکہ کو ''الکافیہ'' کا نام بھی دیا گیا ہے' یعنی یہ انسان کی فکری رہنمائی کے لیے کفایت کرنے والی سورت ہے۔ اس سورۂ مبارکہ کو ''الشافیہ'' کے نام سے بھی موسوم کیا گیا ہے' یعنی اس میں شفاء ہے۔

یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے پورے قرآن مجید کو بھی ''شفاء'' قرار دیا ہے۔ چنانچہ سورۂ یونس کی آیت ۵۷ میں فرمایا گیا:

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ ۙ۬ وَهُدًی وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۵۷﴾﴾

''اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے ربّ کی طرف سے نصیحت آ گئی ہے' اور شفاء بھی دلوں کے امراض کے لیے' اور رہنمائی اور رحمت ان کے لیے جو اِس پر ایمان لے آئیں''۔

سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۸۲ میں فرمایا گیا:

﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۲﴾﴾

''اور ہم اتارتے ہیں قرآن میں سے جس سے روگ دفع ہوں اور رحمت ایمان والوں کے واسطے''۔

یہاں جس شفاء کا تذکرہ ہے اس کے متعلق یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اس سے ذہنی و فکری شفاء اور دل کے روگ جیسے حسد' کینہ' بغض' تکبر وغیرہ باطنی امراض مراد ہیں۔ گویا انسان کی سوچ کو درست کرنے والی کتاب' کتابِ الٰہی ہے اور باطن کے امراض کا مداوا بھی قرآن حکیم ہے۔ اس موقع پر ساتھ ہی یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ انسان کے جسم اور ذہن میں بہت گہرا ربط ہے۔ ذہن وفکر مریض ہوں تو جسم پر بھی اس کے آثار ظاہر ہوں گے۔ قارئین کے علم میں ہوگا کہ آج کل کے دَور میں امراضِ ذہنی ونفسیاتی کا بڑا چرچا ہے۔ یہ دراصل فسادِفکری کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا اگر فکر صحیح ہوگی' سوچ درست ہوگی تو لازماً انسان کو جسمانی تندرستی بھی حاصل ہوگی۔ ان اعتبارات سے پورا قرآن مجید بھی شفاء ہے اور یہ سورۂ مبارکہ بھی' کیونکہ یہ پورے قرآن کے خلاصے کی حامل سورت ہے۔ اس میں مؤمنوں کے لیے ہدایت کے ساتھ ذہنی' فکری اور قلبی شفاء بھی موجود ہے۔ مزید برآں یہ کلام اللہ ہے' اس پر کامل واکمل یقین رکھنے والوں کے لیے اس میں جسمانی طور پر شفاء ہونا بھی مستبعد نہیں۔ سورۃ الفاتحہ کے جسمانی شفاء ہونے کا احادیثِ صحیحہ میں ذکر ملتا ہے۔

## سورۃ الفاتحہ کا اسلوب اور انداز

چوتھی بات اس سورۂ مبارکہ کے اسلوب سے متعلق ہے۔ اگرچہ یہ کلامِ الٰہی ہے لیکن اس کا اسلوب دعائیہ ہے۔ گویا بندوں کو تلقین کی جا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونا چاہو تو اس طور سے ہو۔ مزید گہرائی میں اتر کر غور کریں تو درحقیقت انسان کی فطرتِ سلیمہ کی ترجمانی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ کے جامع الفاظ کی شکل میں فرمائی ہے۔ گویا یہ سورۂ مبارکہ ترانۂ شکر و سپاس اور حمد و ثناء بھی ہے' اس میں اللہ کی

ربوبیتِ کاملہ اوراس کے مالکِ ارض وسماء ہونے کا اقرار بھی ہے' اس کے رحمٰن اور رحیم ہونے کا یقین بھی ہے اوراس کے جزاوسزا کے دن کا مالک ومختارِکُل' نیز اس کے عادل ومنصف اور قادرِمطلق ہونے کا ایقان بھی ہے۔ پھراس میں صرف اسی کی بندگی و پرستش اور صرف اسی سے مدد و اعانت طلب کرنے کا قول وقرار اور عہد و میثاق بھی ہے۔ مزید برآں اس میں اسی سے صراطِ مستقیم پر گامزن کرنے اور منزل تک پہنچانے کی توفیق طلبی بھی ہے۔ چنانچہ اس میں اللہ تعالیٰ سے ان لوگوں کی راہ پر چلانے کی دعا بھی ہے جو نہ مغضوب ہوئے اور نہ گمراہ' بلکہ ان کا شمار اللہ تبارک وتعالیٰ کے محبوب اور انعام یافتہ بندوں میں ہوا۔

گویا اس سورۂ مبارکہ کو اس طرح قرآن مجید کے لیے ایک دیباچہ بنادیا گیا اور بقیہ پورے قرآن مجید سے اس کا تعلق یہ ہوا کہ یہ تو ہے انسان کی فطرتِ سلیمہ کی پکار' اور اس کا جواب وہ ہے جو قرآن آگے پیش کررہا ہے۔ انسان کی فطرت میں جس ہدایت اور سیدھے راستے کی طلب ہے وہ ''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ'' کی دعا کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ اس طلب اور دعائے ہدایت کا جواب ہے یہ پورا قرآن جو محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ البقرۃ کا آغاز ان الفاظِ مبارکہ سے ہوتا ہے: ﴿الٓمّٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝﴾ ''الٓمٓ' یہ کتابِ الٰہی ہے' اس میں کوئی شک وشبہ کی بات نہیں' یہ خدا ترس لوگوں کے لیے ہدایت بن کر نازل ہوئی ہے''۔ اس طرح ایک طرف یہ سورۂ مبارکہ فلسفہ وحکمت کے اعتبار سے فطرتِ انسانی کی ترجمانی پر مشتمل ہے اور دوسری طرف قرآن مجید کے ساتھ اس کا ربط وتعلق تقریباً وہی ہے جو کسی کتاب کے مقدمے یا دیباچے کا اصل کتاب کے ساتھ ہوتا ہے۔

## نماز کا جزوِلازم

پانچویں بات بہت اہم ہے۔ یقیناً یہ بات تمام قارئین کرام کے علم میں ہوگی کہ یہ سورۂ مبارکہ ہماری نماز کا جزوِ لاینفک ہے۔ نماز کی ہر رکعت میں اس کی تلاوت کی جاتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی مشہور حدیث ہے' جو متفق علیہ ہے' یعنی جس کو امام بخاری

اور امام مسلم رحمہما اللہ نے اپنی اپنی جامع صحیح میں روایت کیا ہے کہ ((لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَّمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ))(۱) ''اس شخص کی کوئی نماز نہیں جس نے سورۃ الفاتحہ نہیں پڑھی''۔ ایک اور حدیثِ قدسی ہے جس کے راوی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں اور امام مسلمؒ اسے اپنی صحیح میں لائے ہیں۔ یہ حدیث طویل ہے جس پر اِن شاء اللہ آگے گفتگو ہوگی۔ اس سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آجائے گی کہ اصل نماز سورۃ الفاتحہ ہی ہے۔اس معاملے میں کسی بھی فقہی مسلک میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ سورۃ الفاتحہ ہماری نماز کا جزوِ لازم ہے۔

البتہ اس معاملے میں جو اختلاف ہے اسے چھٹی بات کے طور پر نوٹ کر لیجیے۔ یہ بات بھی یقیناً آپ کے علم میں ہوگی کہ ہمارے یہاں بعض بڑے جلیل القدر ائمہ دین اور فقہائے کرام رحمۃ اللہ علیہم کے مابین بعض مسائل میں کچھ اختلافات قدیم زمانے سے چلے آ رہے ہیں' ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جب کوئی شخص امام کے پیچھے باجماعت نماز پڑھ رہا ہو تو اس صورت میں اسے امام کے پیچھے سورۃ الفاتحہ پڑھنی چاہیے یا نہیں! ایک رائے یہ ہے کہ یہ سورت تو ہر شکل میں پڑھنی ہے' جہری رکعات میں بھی پڑھنی ہے اور سِرّی رکعات میں بھی۔ دوسری رائے اس کے بالکل برعکس ہے' اور وہ یہ کہ جب جماعت کے ساتھ نماز پڑھی جائے تو امام سورۃ الفاتحہ پڑھے لیکن مقتدی قطعاً نہ پڑھیں' نہ جہری رکعات میں نہ سِرّی رکعات میں۔ امام ہی کی قراءت مقتدیوں کی طرف سے سورۃ الفاتحہ کی قراءت شمار ہو جائے گی۔ جیسے ایک وفد کسی دربار میں حاضر ہوتا ہے تو اس وفد کا قائد یا ترجمان جو بات کرتا ہے وہ سب کی طرف سے شمار ہوتی ہے۔ البتہ ایک بین بین رائے بھی ہے' اور وہ یہ ہے کہ اگر جہری رکعت ہے تو امام بلند آواز سے سورۃ الفاتحہ کی قراءت کرے گا اور مقتدی سنیں گے اور اگر سِرّی رکعت ہے تو امام بھی خاموشی سے قراءت کرے گا اور مقتدی بھی اس کے پیچھے خاموشی سے

(۱) صحیح البخاری' کتاب الاذان' باب وجوب القراءۃ للامام والمأموم...... الخ۔ وصحیح مسلم' کتاب الصلاۃ' باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ فی کل رکعۃ ......الخ۔

پڑھیں گے۔ ان آراء کے حاملین کے اپنے اپنے مسلک اور موقف کے لیے نہایت مضبوط اور مبسوط دلائل موجود ہیں۔

اس ضمن میں قارئین کرام کے سامنے جو بات اہمیت اور تاکید کے ساتھ لانی مقصود ہے وہ یہ ہے کہ ان معاملات کے ضمن میں ہمیں اپنے سینوں کو کشادہ رکھنا چاہیے۔ یہ اختلاف خلوص پر مبنی ہے۔ سب صحیح بات تک پہنچنا چاہتے ہیں اور جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے سب کے پاس اپنے اپنے موقف کے دلائل موجود ہیں۔ یہ فروعی اختلافات ہیں۔ دین کی اصل رُوح سے ان کا کوئی براہِ راست تعلق نہیں ہے۔ ہر رائے افضل ومفضول اور راجح ومرجوح کے اصول پر مبنی ہوتی ہے اور ہر رائے میں خطائے اجتہادی کا یکساں احتمال ہوتا ہے' جس کے متعلق اہل سنّت کا مجمع علیہ موقف یہ ہے کہ مبنی بر خلوص اجتہاد میں خطا پر بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں اجر و ثواب عطا ہوگا اور اگر اجتہاد صحیح ہو تب تو اس پر دوہرا اجر ملے گا۔ البتہ اس مسئلے کے ضمن میں خصوصی بات یہ ہے کہ اس میں ہرگز کوئی اختلاف نہیں ہے کہ سورۃ الفاتحہ ہماری نماز کا جزوِلاینفک ہے۔ جب مسلمان انفرادی طور پر نماز پڑھ رہا ہو تو اسے لازماً ہر رکعت میں سورۃ الفاتحہ پڑھنی ہوگی۔ البتہ جب جماعت میں شامل ہو تو ایک رائے یہ ہے کہ امام کی سورۃ الفاتحہ کی قراءت تمام مقتدیوں کی طرف سے بھی کفایت کرے گی۔ دوسری رائے یہ ہے کہ مقتدی کو بھی ہر رکعت میں امام کے پیچھے یہ سورۃ پڑھنی ہوگی' اور ایک درمیانی رائے یہ ہے کہ مقتدی جہری نماز میں خاموش رہے گا' البتہ سِرّی رکعت میں خود بھی سورۃ الفاتحہ پڑھے گا۔

## تعدادِ آیات

ساتویں بات اس سورۂ مبارکہ کی آیات سے متعلق ہے۔ یہ چیز متفق علیہ ہے کہ اس سورت کی آیات کی تعداد سات ہے۔ جیسا کہ میں نے سورۃ الحجر کی آیت کے حوالے سے عرض کیا تھا کہ تمام مسالک کے نزدیک ''سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ'' کی مصداق یہ سورۂ مبارکہ ہے۔ لہٰذا آیات کی تعداد سات ہونے میں کوئی اختلاف ممکن نہیں۔ البتہ

اس میں ایک اختلاف یہ ہے کہ بعض علمائے کرام ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' کو بھی اس میں شامل کرتے ہیں' جبکہ اکثر علماء ''بِسْمِ اللّٰهِ ......'' کو سورۃ الفاتحہ کا جزو نہیں مانتے۔ ان کے نزدیک وہ بالکل علیحدہ ایک مستقل افتتاحی آیت ہے جو سورۃ البراءۃ (سورۃ التوبۃ) کے علاوہ ہر سورۃ کے آغاز میں لکھی جاتی ہے' لیکن اُس سورۃ کا جزو نہیں ہوتی۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ علماء اور قرّاء کے مابین خلوص سے بھی اختلافِ رائے ہوتا ہے' جس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اختلاف کی گنجائش بہرحال ہوتی ہے۔ اگرچہ وزنی رائے وہی معلوم ہوتی ہے جو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی ہے کہ اس سورۂ مبارکہ میں ''بسم اللہ'' شامل نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس رائے کی پشت پر دلیل وہ حدیثِ قدسی ہے جس کا قدرے تفصیل سے ذکر آگے آئے گا۔

## تین حصوں پر مشتمل سورت

آٹھویں بات یہ ہے کہ اس سورۂ مبارکہ کے تین حصے ہیں۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ اگرچہ آیات سات ہیں لیکن نحوی اعتبار اور گرامر کے اصولوں کے لحاظ سے ان سات آیات سے مکمل جملے تین ہی بنتے ہیں۔ پہلی تین آیات: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝﴾ گرامر کی رو سے ایک ہی جملہ ہے اور نحوی اعتبار سے یہ ''جملہ اسمیہ خبریہ'' ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء اور شکر و سپاس ہے' اس کی صفاتِ رحمانی و رحیمی اور عدل و قسط کا بیان ہے۔ پھر چوتھی آیت جو اِس سورۂ مبارکہ کی مرکزی آیت ہے' خود ایک مکمل جملہ ہے' بلکہ اس کے مزید تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ایک آیت میں دو مکمل جملے موجود ہیں۔ بہرحال یہ ہے ''جملہ فعلیہ خبریہ''۔ یہ مرکزی آیت ہے: ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝﴾ ''(اے ربّ ہمارے!) ہم صرف تیری ہی بندگی و پرستش کرتے ہیں اور کریں گے' اور صرف تجھی سے مدد چاہتے ہیں اور چاہیں گے''۔ یہاں حصر کا اسلوب ہے اور عربی میں چونکہ فعل مضارع میں حال اور مستقبل دونوں کے معنی ہوتے ہیں' لہٰذا ان امور کا ترجمہ میں لحاظ

رکھا گیا ہے۔اس آیت میں ربّ اور بندے کے مابین ایک قول وقرار اور ایک معاہدہ و میثاق ہے۔ یہ مسلّمہ بات ہے کہ معاہدے میں دو فریق منسلک ہوتے ہیں' لہٰذا یہ ''جملہ فعلیہ خبریہ'' درحقیقت اللہ اور بندے کے درمیان عہد و پیمان ہے۔

تیسرا حصہ جو آخری تین آیات پر مشتمل ہے: ﴿اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ ۵ غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ وَلَا الضَّآلِّيۡنَ ۝﴾ ''(اے ربّ ہمارے!) ہمیں سیدھی راہ کی ہدایت بخش' اُن لوگوں کی راہ کہ جن پر تو نے انعام فرمایا' جو نہ مغضوب ہوئے اور نہ گمراہ'' یہ بھی ایک ہی جملہ بنتا ہے اور نحو کے اعتبار سے یہ ''جملہ انشائیہ'' ہے۔ یہ ایک دعا ہے۔اس میں ایک بندہ اپنے ربّ سے' جس کی وہ تحمید وتمجید کر چکا' جس کی ربوبیت' رحمانیت' رحیمیت اور عدالت کا اقرار کر چکا' پھر جس سے وہ عبادت واستقامت کا عہد بھی استوار کر چکا' اب وہ اسی ربّ سے اپنی فطرت کی پکار اور پیاس کی سیرابی کے لیے ''صراطِ مستقیم'' یعنی زندگی بسر کرنے کے لیے معتدل و متوازن طرزِ زندگی اور راہِ عمل کی رہنمائی اور توفیق کا طلب گار اور مستدعی ہے۔

اس موقع پر نویں اور آخری بات سے قبل وہ حدیثِ قدسی ترجمہ کے ساتھ پیش کرنی مناسب ہے جس کا ذکر پہلے دو بار ہو چکا ہے اور جو امام مسلمؒ نے اپنی صحیح میں روایت کی ہے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ اِنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَقُوْلُ :((قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی :قَسَمْتُ الصَّلَاةَ بَيْنِیْ وَبَيْنَ عَبْدِیْ نِصْفَيْنِ وَلِعَبْدِیْ مَا سَأَلَ' فَاِذَا قَالَ الْعَبْدُ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: حَمِدَنِیْ عَبْدِیْ' وَاِذَا قَالَ ﴿اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی:اَثْنٰی عَلَیَّ عَبْدِیْ' وَاِذَا قَالَ ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ قَالَ مَجَّدَنِیْ عَبْدِیْ ــــ وَقَالَ مَرَّةً: فَوَّضَ اِلَیَّ عَبْدِیْ ــــ فَاِذَا قَالَ ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ قَالَ هٰذَا بَيْنِیْ وَبَيْنَ عَبْدِیْ وَلِعَبْدِیْ مَا سَأَلَ' فَاِذَا قَالَ ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ قَالَ هٰذَا

لِعَبْدِیْ وَلِعَبْدِیْ مَا سَأَلَ)) (۱)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان دو حصوں میں برابر تقسیم کر دیا ہے (اس کا نصف حصہ میرے لیے اور نصف حصہ میرے بندے کے لیے ہے) اور میرے بندے کو وہ عطا کیا گیا جو اُس نے طلب کیا۔ جب بندہ کہتا ہے: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ'' تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری حمد کی (میرا شکر ادا کیا)۔ جب بندہ کہتا ہے: ''الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری ثناء کی۔ جب بندہ کہتا ہے: ''مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ'' تو اللہ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری بزرگی اور بڑائی بیان کی ......''

گویا یہ پہلا حصہ کُل کا کُل اللہ کے لیے ہے۔ آگے بڑھنے سے قبل قارئین اس مقام پر یہ بات نوٹ فرما لیں کہ اس حدیث قدسی میں ''قَسَمْتُ الصَّلَاۃَ بَیْنِیْ وَبَیْنَ عَبْدِیْ نِصْفَیْنِ'' کے بعد آیت ''بسم اللہ'' کا ذکر موجود نہیں' بلکہ ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ'' سے براہِ راست بات آگے بڑھتی ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آیت ''بسم اللہ'' سورۃ الفاتحہ میں شامل نہیں ہے۔ اب حدیث کی طرف رجوع فرمایئے:

''جب بندہ کہتا ہے: ''اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ'' تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ حصہ میرے اور میرے بندے کے مابین مشترک ہے اور میں نے اپنے بندے کو بخشا جو اُس نے مانگا''۔

گویا یہ حصہ ایک معاہدہ ہے' قول و قرار ہے' عہد و میثاق ہے۔ اس میں بندے نے ''اِیَّاكَ نَعْبُدُ'' کہہ کر اللہ کی عبادت کا عہد کیا ہے اور ''وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ'' میں کچھ طلب بھی کیا ہے' مدد بھی چاہی ہے۔ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''یہ میرے بندے کے لیے ہے اور میں نے اپنے بندے کو دیا جو اُس نے مجھ سے طلب کیا''۔ اب آخری حصہ رہ گیا۔ فرمایا:

(۱) صحیح مسلم' کتاب الصلاۃ' باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ فی کل رکعۃ ...... الخ

''جب بندہ کہتا ہے : ''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ'' تو اللہ فرماتا ہے کہ یہ حصہ (کُل کا کُل) میرے بندے کے لیے ہے اور میرے بندے نے جو کچھ مجھ سے طلب کیا وہ میں نے اُسے بخشا''۔

اس حدیث کی رو سے سورۃ الفاتحہ کے تین حصے بن جائیں گے۔ پہلا حصہ کلیۃً اللہ کے لیے ہے اور آخری حصہ کلیۃً بندے کے لیے' جبکہ درمیانی و مرکزی آیت : ''اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ'' بندے اور اللہ کے مابین قول و قرار ہے۔ گویا اس کا بھی نصفِ اوّل اللہ کے لیے اور نصفِ ثانی بندے کے لیے ہے۔ اس طرح نصف نصف کی تقسیم بتمام و کمال پوری ہوگئی!

## ''آمین'' کی حیثیت

اس سورۂ مبارکہ کے بارے میں نویں اور آخری بات یہ ہے کہ اس سورۂ مبارکہ کے اختتام پر ''آمین'' کہنا مسنون ہے۔ آمین کے معنی ہیں ''اے اللہ ایسا ہی ہو''۔ یہ ابتدا ہی میں عرض کیا جا چکا ہے کہ اس سورۂ مبارکہ کا اسلوب دعائیہ ہے' لہٰذا دعا کے اختتام پر ''آمین'' کہہ کر گویا بندہ پھر بارگاہِ الٰہی میں عرض کرتا ہے کہ ''اے پروردگار! میں نے یہ استدعا اور یہ عرضداشت تیرے حضور پیش کی ہے' تو اسے شرفِ قبول عطا فرما۔ اے پروردگار ایسا ہی ہو۔''

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ سورۃ الفاتحہ کی تلاوت کے بعد تمام فقہی مسالک میں آمین کہنے کے مسنون ہونے پر اتفاق ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ امام کے پیچھے جہری رکعت میں آمین اونچی آواز سے کہی جائے یا پست آواز سے' تو ان سب آراء رکھنے والوں کے پاس دلائل موجود ہیں۔ یہ بھی ایک فروعی اختلاف ہے۔ اس میں جو متفقہ بات ہے وہ ہماری رہنمائی کے لیے کفایت کرتی ہے کہ سب کے نزدیک سورۃ الفاتحہ کی قراءت کے بعد ''آمین'' کہنا مسنون ہے۔

ہم نے اس سورۂ مبارکہ کے بارے میں جو چند تمہیدی و بنیادی باتیں سمجھی ہیں دعا

ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ہماری نمازوں میں جان، خشوع وخضوع اور حضوریٔ قلب پیدا ہو جانے کا ذریعہ بنا دے۔ اور جب ہم اپنی نمازوں میں سورۃ الفاتحہ کی قراءت کریں تو اس کے مفہوم کو سمجھ کر ذہنی اور قلبی وابستگی کے ساتھ اس سورۂ مبارکہ کے الفاظ کو اپنی زبان سے ادا کریں اور دل کی گہرائیوں سے اس بات کے آرزومند ہوں کہ اس سورت کے ذریعے جس صراطِ مستقیم کی استدعا کی جاتی ہے، وہ ہمیں بالفعل حاصل ہو جائے اور ہمیں اس پر چلنے کی توفیق کی بھی بارگاہِ ربّانی سے ارزانی ہو۔ آمین!

# سورۃ الفاتحہ کا جزوِ اوّل

سورۃ الفاتحہ کے سلیس و رواں ترجمے، اس کے بارے میں چند تمہیدی باتوں اور اس کے مضامین کے اجمالی تجزیے کے بعد اب ہم اس سورۂ مبارکہ کے تینوں حصوں کو علیحدہ علیحدہ قدرے گہرائی میں اتر کر سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ جیسے کہ اس سے قبل بیان کیا جا چکا ہے، اس سورۂ مبارکہ کا جزوِ اوّل تین آیات پر مشتمل ہے:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝﴾

''کُل شکر اور کُل ثنا اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار اور مالک ہے، بہت رحم فرمانے والا، نہایت مہربان، جزا و سزا کے دن کا مالک و مختار ہے''۔

## اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ

نوٹ کیجیے کہ یہ سورۂ مبارکہ قرآن مجید کی افتتاحی سورت ہے اور اس کا ابتدائی کلمہ ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ یہ کلمہ طیبہ نہایت عظیم اور بہت بلند مرتبت ہے۔ اس کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے لفظ ''حمد'' کو اچھی طرح جان لینا ضروری ہے۔ عام طور پر اس کا ترجمہ صرف ایک لفظ ''تعریف'' سے کر دیا جاتا ہے، حالانکہ تعریف بھی عربی کا لفظ ہے اور حمد بھی عربی کا لفظ ہے۔ اور یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ کسی زبان کے دو الفاظ بالکل ہم معنی نہیں ہوتے، ان کے معنی و مفہوم میں لازماً کچھ نہ کچھ فرق ضرور

ہوتا ہے۔ اگر گہرائی میں اتر کر دیکھا جائے تو لفظ ''حمد'' میں دو مفہوم شامل ہیں' ایک شکر اور دوسرا ثناء۔ شکر کا لفظ سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کے ضمن میں تفصیلاً زیر بحث آ چکا ہے۔ وہاں واضح کیا جا چکا ہے کہ اگر فطرت اپنی صحت پر برقرار ہو تو اس کا تقاضا جذبۂ تشکر ہے اور اگر عقل صحیح نہج پر کام کر رہی ہو تو اس کا حاصل اپنے منعمِ حقیقی اور اپنے اصل مربی و محسن یعنی اللہ کو پہچان لینا ہے۔ فطرتِ سلیمہ اور عقلِ صحیحہ دونوں کے امتزاج سے جو چیز حاصل ہوتی ہے اس کا نام ''حکمت'' ہے۔ لٰہذا حکمت کا لازمی تقاضا اللہ کا شکر ہے۔ یہی بات اس سورۂ مبارکہ کے ابتدائی کلمات میں آئی ہے کہ ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ''۔ لیکن حمد کا لفظ شکر سے زیادہ وسیع تر مفہوم کا حامل ہے۔ کسی کا شکر ایسی چیز پر ادا کیا جاتا ہے جس کا کوئی فائدہ شکر کرنے والے کی ذات کو پہنچ رہا ہو۔ لیکن ثناء اور تعریف کی جاتی ہے کسی بھی حسن و جمال یا کمال کی خواہ اس کا ہمیں کوئی فائدہ پہنچا ہو یا نہ پہنچا ہو۔ حمد کے لفظ میں یہ دونوں چیزیں جمع ہیں' یعنی شکر بھی اور ثناء بھی۔ لٰہذا ہم نے ترجمہ میں ان دونوں کو جمع کر دیا ہے کہ ''کُل شکر اور کُل ثناء اللہ کے لیے ہے''۔

ایک دوسرے پہلو سے غور کیجیے تو آپ اس نتیجے سے اتفاق کریں گے کہ یہ کلمۂ توحید ہے۔ ہم یہ بات جانتے ہیں کہ اس کائنات میں جہاں کہیں بھی کوئی مظہرِ حسن ہے' مظہرِ کمال ہے' مظہرِ جمال ہے اُن کے متعلق ہماری عقل صحیحہ یہ رہنمائی کرتی ہے کہ ان تمام محاسن و کمالات کا منبع اور سرچشمہ صرف اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذاتِ اقدس ہے۔ لٰہذا اصل تعریف اور ثناء ان اشیاء کی نہیں ہوتی بلکہ اللہ کی ہوتی ہے۔ کلمۂ توحید کا اقتضاء یہی ہے کہ موحّد کے شعور اور تحت الشعور سب میں یہ بات مستحضر رہے کہ کائنات کی ہر نعمت' ہر چیز' ہر حسن' ہر جمال اور ہر کمال' الغرض کوئی بھی وصف کسی کا ذاتی نہیں' بلکہ اللہ کا ودیعت کردہ ہے۔ جیسے تصویر میں اگر کوئی حسن ہے تو وہ درحقیقت مصوّر کے کمالِ فن کی عکاسی ہے۔ تصویر کا اپنا کوئی حسن نہیں' نہ اس کا کوئی اپنا ذاتی کمال ہے۔ بالکل اسی طرح کسی مخلوق میں اگر کوئی حسن اور کمال ہے یا کوئی خوبی اور جمال ہے تو وہ حسن و کمال اور خوبی و جمال خالق کا ہے' نہ کہ مخلوق کا۔ چنانچہ اس کُل سلسلۂ کون و مکان میں جہاں

کوئی حسن، کوئی کمال، کوئی خیر، کوئی خوبی اور کوئی جمال ہے یا کسی شے میں کوئی نفع رسانی کا پہلو ہے تو اس کا منبع و سرچشمہ ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ لہٰذا شکر کا سزاوارِ حقیقی اور تعریف وثناء کا اصل مستحق اللہ تعالیٰ ہے۔

یہ کلمہ ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ'' اتنا عظیم اور اعلیٰ مرتبت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ یہ کلمہ آسمان و زمین کو اپنی برکات سے بھر دیتا ہے۔ حضرت ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی فرمانِ نبویؐ ہے:

((اَلطُّهُوْرُ شَطْرُ الْاِیْمَانِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ تَمْلَأُ الْمِیْزَانَ وَسُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ تَمْلَآنِ [اَوْ تَمْلَأُ] مَا بَیْنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ))(۱)

''صفائی نصف ایمان ہے اور کلمہ ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ'' میزان کو بھر دیتا ہے اور کلمات ''سُبْحَانَ اللّٰہِ'' اور ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ'' نہ صرف میزان کو پُر کر دیتے ہیں بلکہ آسمان و زمین کے مابین جو کچھ ہے (خلا، فضا) اس سب کو پُر کر دیتے ہیں۔''

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے انعام واکرام اور احسانات کے ضمن میں انبیاء و رُسل علیہم السلام اور صالحین کے جو کلماتِ شکر منقول ہوئے ہیں اور اس سلسلے میں نبیِ اکرم ﷺ نے جن دعاؤں کی تعلیم و تلقین فرمائی ہے ان میں سے اکثر و بیشتر میں یہ کلمہ ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ'' استعمال ہوا ہے۔ طوالت سے بچنے کی خاطر دو مثالیں قرآن مجید اور دو مثالیں حدیث شریف سے پیش کرنے پر اکتفا کرنا ہوگا۔ سورۂ ابراہیم میں وارد ہے کہ جب بڑھاپے میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسماعیل اور حضرت اسحٰق علیہما السلام جیسے صالح فرزند عطا فرمائے جو آگے چل کر منصبِ نبوت پر بھی سرفراز ہوئے تو اس احسان وانعام ونعمت اور کرم پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان پر ترانۂ شکر جاری ہوا کہ:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَی الْكِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبِّیْ لَسَمِیْعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۹﴾﴾

''کُل شکر اور ثناء اللہ کے لیے ہے جس نے مجھے بڑھاپے کے باوجود اسماعیل اور اسحٰق (علیہما السلام) عطا فرمائے۔ یقیناً میرا ربّ دعا کا سننے (اور قبول کرنے)

(۱) صحیح مسلم، کتاب الطھارۃ، باب فضل الوضوء۔

والا ہے‘‘۔

ایک اور مثال سورۃ الاعراف سے دیکھ لیجیے۔ جب مؤمنین صادقین کو حساب کتاب کے بعد جنت میں داخلے کا اِذن ملے گا تو اُن کی زبانوں پر کلمۂ شکر و سپاس اور تعریف و ثناء ان الفاظ میں جاری ہوگا کہ:

﴿وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۫ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْ لَاۤ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ﴾ (آیت۴۳)

’’اور وہ کہیں گے کُل شکر اور کُل ثناء اُس اللہ کی ہے جس نے ہمیں اس کی ہدایت فرمائی (بلکہ یہاں تک پہنچا دیا) اور ہم خود ہدایت نہ پا سکتے (اور یہاں تک ہرگز نہ پہنچ پاتے) اگر اللہ ہی ہماری رہنمائی نہ فرماتا‘‘۔

رسول اللہ ﷺ نے سو کر اٹھنے کی یہ دعا تلقین فرمائی:

((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَحْیَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاِلَیْهِ النُّشُوْرُ)) (۱)

’’کُل شکر و ثناء اللہ کی ہے جس نے ہمیں زندہ کیا اس کے بعد کہ ہم پر موت طاری کر دی تھی اور (ایک دن اسی طرح) اس کی جانب لوٹ جانا ہے‘‘۔

اور آپؐ نے اکل و شُرب کے بعد کی دعا ان الفاظ میں تلقین فرمائی:

((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مُسْلِمِیْنَ)) (۲)

’’کُل شکر اور ثناء اس اللہ کے لیے ہے جس نے ہمیں کھلایا اور پلایا اور ہمیں مسلمان بنایا۔‘‘

## رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ

اب آگے باری تعالیٰ کی چند مزید صفاتِ کمال کا ذکر ہو رہا ہے۔ پہلی بات سامنے آتی ہے: ’’رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ‘‘ جو تمام جہانوں کا مالک اور پروردگار ہے۔ ’’ربّ‘‘ کے لفظ

(۱) صحیح البخاری، کتاب الدعوات، باب ما یقول اذا اصبح۔ وصحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبۃ والاستغفار، باب ما یقول عند النوم واخذ المضجع۔

(۲) سنن الترمذی، کتاب الدعوات، باب ما یقول اذا فرغ من الطعام۔ وسنن ابی داوٗد، کتاب الاطعمۃ، باب ما یقول الرجل اذا طعم۔

میں یہ دونوں مفہوم شامل ہیں۔ عرب گھر کے مالک کو رَبُّ الْبَیْتِ یا رَبُّ الدَّار کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں ربّ کا لفظ مالک کے معنوں میں متعدد مقامات پر استعمال ہوا ہے۔ جیسے سورۃ القریش میں آتا ہے: ﴿فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ۝۳﴾ ''پس عبادت کرو اِس گھر (حرم شریف) کے مالک کی''۔ پھر ربّ کا مفہوم پرورش کرنا' ترقی اورنشوونما دینا بھی ہے۔ ایک مالک ایسا نا اہل اور ناکارہ بھی ہوسکتا ہے جو اپنی ملکیت کو لے کر بیٹھ رہے' اس کی ترقی اورنشوونما کی اسے کوئی خاص پروانہ ہو' اور ایک مالک ایسا قابل وقادر ہوتا ہے کہ اس کی ملکیت میں جو چیزیں ہیں وہ ان میں سے ہر چیز کو اُس کی استعدادات کے مطابق پروان چڑھائے اور ہر شے کو اُس کے نقطۂ کمال تک پہنچانے کا سامان فراہم کرے! پس اللہ کی ذاتِ گرامی وہ ہے جو ہر شے کے نقطۂ عروج وکمال تک پہنچنے کے جملہ مقتضیات کو فراہم کرنے اور بہم پہنچانے والی ہے۔ ''عَالَمِیْنَ'' عالم کی جمع ہے۔ لہٰذا یہاں ربّ العالمین کا مفہوم ہوگا سارے جہانوں کی مخلوقات کا مالک اور پروردگار اللہ ہی ہے' آقا بھی وہی ہے اور پرورش کنندہ بھی وہی ہے۔

## الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اگلی آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا ایک اور وصف ''الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے دو بڑے عظیم صفاتی نام ہیں۔ دونوں کا مادہ رحمت ہے۔ اسی رحمت سے ''رحمٰن'' اور اسی سے ''رحیم'' بنا۔ ان دونوں کے فرق کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔ عربی زبان میں ''فَعْلَانُ'' کے وزن پر جب کوئی صفت آتی ہے تو اس میں ایسا نقشہ سامنے آتا ہے جیسے کسی شے میں جوش وخروش اور طوفانی اور ہیجانی کیفیت ہو۔ خود ہیجان بھی فَعْلَان کے وزن ہی پر ہے۔ تشبیہہ کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ جیسے سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہو' اس میں زبردست ہلچل ہو۔ کسی صفت کی یہ کیفیت ہو تو عربی میں اسے اکثر فعلان کے وزن پر لایا جاتا ہے۔ مثلاً جب کہا جائے ''اَنَا عَطْشَانُ'' تو مفہوم ہوگا ''میں شدید پیاسا ہوں' یا پیاس سے مرا جارہا ہوں''۔ ''اَنَا

جَوْعَانُ'' کا مفہوم ہوگا ''میں بہت بھوکا ہوں' یا بھوک سے میری جان نکل رہی ہے''۔ ''هُوَ غَضْبَانُ'' کا مطلب ہے ''وہ نہایت غصے اور طیش میں ہے''۔ ان امور کو سامنے رکھئے اور اب ''رَحْمٰن'' کے لفظ کو سمجھئے کہ اس کے معنی کیا ہوں گے! رحمٰن وہ ہستی ہے جس کی رحمت ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کے مانند ہے۔ جس کی رحمت میں انتہائی جوش و خروش ہے۔

البتہ ''فَعِیْل'' کے وزن پر جب کوئی صفت آتی ہے تو اس صفت میں اس کے دوام و استمرار کا مفہوم شامل ہوتا ہے۔ یعنی یہ وقتی جوش و خروش نہیں ہے بلکہ اس میں پائیداری و استواری اور مستقل مزاجی ہے۔ گویا اللہ کی رحمت کی شان یہ بھی ہے کہ اس میں دوام اور استمرار ہے' جیسے ایک دریا ہمواری کے ساتھ مسلسل بہہ رہا ہے' اس میں ہیجان نہیں ہے' سمندر کی طرح کا جوش و خروش نہیں ہے' لیکن بہاؤ کا ایک خاموش اور پُر سکون تسلسل ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کی یہ دونوں شانیں ہیں جو بیک وقت موجود ہیں۔ یعنی وہ بیک وقت رحمٰن بھی ہے' رحیم بھی ہے۔ اس بات کو ایک تشبیہہ سے مزید سمجھا جا سکتا ہے۔ فرض کیجیے کہ سڑک پر کوئی حادثہ ہو گیا ہے جس میں کئی افراد ہلاک ہو گئے ہیں اور فرض کیجیے کہ اس حادثے میں ایک ایسی عورت بھی ہلاک ہو گئی جس کی گود میں ایک دودھ پیتا بچہ بھی تھا۔ وہ بچہ زندہ ہے اور اپنی مُردہ ماں کی چھاتی سے چمٹا ہوا ہے۔ یہ کیفیت دیکھ کر کون انسان ہوگا جس کے دل میں رقت پیدا نہ ہو اور شفقت و رحمت کے جذبات موجزن نہ ہو جائیں! ہر انسان یہ چاہے گا کہ یہ بچہ جو بے سہارا ہو گیا ہے' میں اس کی کفالت اپنے ذمہ لے لوں' اس کی پرورش میں کروں۔ لیکن اگر وہ اس جوش میں یہ ذمہ داری لے بیٹھا' تو ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ اکثر و بیشتر یہ وقتی جوش بہت جلد ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ ہی دنوں کے بعد اسے محسوس ہو کہ میں یہ کیا غلطی کر بیٹھا! میرے اپنے بچے ہیں' میری بے شمار ذمہ داریاں پہلے سے موجود تھیں' اب اِن پر مستزاد یہ بوجھ میں نے خواہ مخواہ اپنے سر لے لیا۔ گویا وقتی طور پر وہ ہیجانی کیفیت جو اُس کے دل میں پیدا ہوئی تھی جس کے زیر اثر اس نے بے سہارا بچے کی کفالت کی ذمہ داری

لے لی تھی‘ اس میں دوام واستمرار نہیں تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت کی یہ دونوں شانیں بیک وقت ہیں۔ وہ بیک وقت رحمٰن بھی ہے اور رحیم بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ’’الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم‘‘ کے مابین حرفِ عطف ’’وَ‘‘ نہیں آیا‘ بلکہ یہاں فرمایا: ’’الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ‘‘ یعنی اس میں یہ دونوں صفات‘ یہ دونوں شانیں بیک وقت بتمام وکمال موجود ہیں۔

## ایک اعتراض اور اس کا جواب

اب ذرا اس بات پر غور کیجیے کہ یہ سورۃ الفاتحہ یعنی قرآن مجید کی بالکل ابتدائی سورت کی پہلی دو آیات ہیں‘ اور ان میں اللہ تعالیٰ کا جو تعارف ہمارے سامنے آتا ہے اس میں کون سی چیز غالب ہے؟ وہ ہے اُس کی ذات کا لائق حمد وثناء اور قابلِ شکر و امتنان ہونا اور اس کی ربوبیتِ عامّہ اور اس کی رحمتِ تامّہ! یہ ہے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ابتدائی تعارف جو قرآن نوعِ انسانی سے کراتا ہے۔ یہاں اس اعتراض کو بھی پیش نظر رکھ لیجیے جو بعض مستشرقین اور ان کی تقلید میں اکثر آریہ سماجیوں نے قرآن مجید اور اسلام پر کیا ہے‘ پھر اس اعتراض کے صحیح جواب کو بھی جان لیجیے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن میں اللہ کے خوف پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے اور اسی کو زیادہ نمایاں کیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں خوف‘ تقویٰ‘ میدانِ حشر کے مصائب‘ جہنم کے عذاب اور اس کی روح فرسا تفصیلات کی بہت تکرار ہے‘ جبکہ ہمارے مذہب میں اللہ کی محبت اور اس کے شفیق ورحیم ہونے پر بہت زور ہے۔ یہ درحقیقت قرآن مجید پر بہتان ہے‘ اس لیے کہ قرآن مجید بالکل افتتاحی سورت میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا جو ابتدائی تعارف کرا رہا ہے وہ‘ معاذ اللہ‘ ثم معاذ اللہ‘ کسی خوفناک ہستی کا تعارف نہیں ہے‘ بلکہ ایک پروردگار اور پالن ہار‘ ایک سراپا رحمت وشفقت ذات‘ ایک شفیق اور ودود ہستی اور ایک رحمٰن ورحیم آقا کا تعارف کرا رہا ہے‘ جو تمام صفاتِ کمال سے متصف ہے اور جس کی ذاتِ اقدس میں تمام محاسن موجود ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ اس کا اصل اور حقیقی تعارف تو یہ ہے جو سورۃ الفاتحہ کی ان دو آیات میں بیان ہوا۔ البتہ یہ بات اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ

سب لوگ محبت کے رمز آشنا اور قدر شناس نہیں ہوتے' اکثر لوگ پست ذہنی سطح ہی کے حامل ہوتے ہیں' جن کے بارے میں علامہ اقبال مرحوم نے کہا ہے:

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

ایسے لوگوں کے لیے ضرورت ہے کہ انہیں خوف بھی دلایا جائے' اُن کے دلوں میں باز پُرس کا احساس بھی اُجاگر کیا جائے' ان کو عذابِ الٰہی سے خبردار بھی کیا جائے اور برے کاموں کی سخت سزا سے ڈرایا بھی جائے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں دونوں چیزیں یعنی اللہ تعالیٰ کے غفور' ستار' رحیم' رحمٰن' رؤف' وَدود ہونے کی شانیں بھی ملیں گی اور قہار' ذوانتقام' سریع الحساب ہونے کا ذکر بھی ملے گا۔

ابتدا میں نبی اکرم ﷺ کو جو احکام ملے ہیں ان میں آپ ﷺ کو اس طرح مخاطب کیا گیا ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝﴾ (المدثر) ''اے لحاف میں لپٹ کر لیٹنے والے (ﷺ)! کھڑے ہو جاؤ (کمربستہ ہو جاؤ) اور لوگوں کو خبردار کرو''۔ ایک اور جگہ فرمایا: ﴿وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ۝﴾ (الشعراء) ''اور (اے نبیؐ!) اپنے رشتہ داروں اور قریبی اعزّہ کو خبردار کیجیے''۔ تو ابتدا میں انذار کا پہلو ضرور غالب رہا لیکن اصولاً قرآن مجید جس اللہ پر ایمان کی دعوت دیتا ہے وہ' معاذ اللہ' کوئی خوفناک ہستی نہیں' بلکہ محبت کرنے والی' اور محبت ہی نہیں پرستش کرنے کے لائق ہستی ہے' اس سے محبت کرو' اسے چاہو' اس سے لو لگاؤ۔ جیسے کہ سورۃ البقرۃ میں ارشاد ہوا: ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۭ﴾ (آیت ۱۶۵) ''اور جو واقعتاً صاحب ایمان ہیں وہ تو سب سے زیادہ اور شدید محبت اللہ تعالیٰ کے ساتھ کرتے ہیں''۔ اور اس محبت کی اساسات ہیں جو سورۃ الفاتحہ کی ابتدائی دو آیات میں ہمارے سامنے آئیں کہ اللہ تعالیٰ تمام محاسن و کمالات کا جامع ہے' منبع و سرچشمہ ہے' وہ کائنات کا ربّ ہے' مالک ہے' پروردگار ہے' پالن ہار ہے' وہ الرحمٰن ہے' الرحیم ہے۔ اس کی رحمت ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کے مانند بھی ہے اور استمرار اور دوام کے ساتھ بہنے والے دریا کے مانند بھی ہے۔

# مٰلِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ

تیسری آیت میں دوسرا رُخ آ رہا ہے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے' یعنی انذار۔ فرمایا: ﴿مٰلِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ ؈﴾ زندگی محض اس دنیا کی زندگی تک محدود نہیں ہے' بلکہ یہ زندگی ایک امتحان گاہ ہے' جس میں آزمائش ہوتی ہے کہ انسان کس طرح زندگی بسر کرتا ہے۔ جیسے سورۃ الملک میں فرمایا گیا: ﴿خَلَقَ الۡمَوۡتَ وَالۡحَيٰوةَ لِيَبۡلُوَكُمۡ اَيُّكُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا ؕ﴾ (آیت ۲) ''موت اور زندگی کو اس (اللہ تبارک وتعالیٰ) نے پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ تم کو آزمائے (اور دیکھے) کہ تم میں کون اچھے عمل کرنے والا ہے''۔ لہٰذا اس آزمائش اور امتحان کا لازمی تقاضا ہے کہ جزا وسزا کا ایک دن بھی ہو۔ اور وہ دن آ کر رہے گا جس دن لوگوں کو اپنے اعمال کا پورا پورا بدلہ ملے گا' ہر انسان کا محاسبہ ہوگا اور اسے جواب دہی کرنی ہوگی۔ اس محاسبہ اور حساب کتاب کے نتیجے میں جزا یا سزا کے فیصلے صادر ہوں گے۔ یہ ہوگا ''یومُ الدین''، جس کے متعلق ہم آیۂ بر کے درس میں پڑھ چکے ہیں۔ اس کے بارے میں سورۃ الذّٰریٰت میں فرمایا گیا: ﴿اِنَّمَا تُوۡعَدُوۡنَ لَصَادِقٌ ۙ؂ وَّاِنَّ الدِّيۡنَ لَوَاقِعٌ ؆﴾ ''جو وعدہ تم سے کیا جا رہا ہے وہ سچا ہے اور جزا وسزا واقع ہو کر رہے گی''۔ اس محاسبہ کے نتیجے میں یا جنت ہوگی ہمیشہ کے لیے یا آگ ہوگی دائمی۔ جیسا کہ نبی اکرم ﷺ کے ابتدائی خطبات میں سے ایک خطبہ کے آخر میں آتا ہے:

((وَاللّٰهِ لَتَمُوۡتُنَّ كَمَا تَنَامُوۡنَ ثُمَّ لَتُبۡعَثُنَّ كَمَا تَسۡتَيۡقِظُوۡنَ، ثُمَّ لَتُحَاسَبُنَّ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ، ثُمّ لَتُجۡزَوُنَّ بِالۡاِحۡسَانِ اِحۡسَانًا وَبِالسُّوۡءِ سُوۡءً ، وَاِنَّهَا لَجَنَّـةٌ اَبَدًا اَوۡ لَنَارٌ اَبَدًا))

''اللہ کی قسم! تم سب (ایک دن) مر جاؤ گے جیسے (روزانہ) سو جاتے ہو' پھر یقیناً اٹھائے جاؤ گے جیسے (ہر صبح) بیدار ہو جاتے ہو' پھر لازماً تمہارے اعمال کا حساب کتاب ہوگا' پھر لازماً تمہیں بدلہ ملے گا اچھائی کا اچھا اور برائی کا برا (اور یہ اس شکل میں ہوگا کہ) وہ جنت ہے ہمیشہ کے لیے یا آگ ہے دائمی''۔

اُس فیصلے اور جزا وسزا کے دن کا مالک ومختار صرف اللہ ہے۔ ''مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ''۔ اور اس روز اللہ کے سوا کسی کے پاس کوئی اختیار نہیں ہوگا۔ چنانچہ ایک جگہ قرآن مجید میں الفاظ آئے ہیں کہ اُس روز ایک ندا ہوگی: ﴿لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ﴾ ''آج کے دن بادشاہی کس کی ہے؟'' اور پھر جواب میں فرمایا جائے گا: ﴿لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾ (المؤمن: ١٦) ''آج تمام اختیار اور کُل بادشاہی صرف اللہ کے لیے ہے جو الواحد ہے (تنہا ہے' یکتا ہے) اور پوری طرح سے قابو یافتہ اور مسلط ہے (مقتدرِ اعلیٰ ہے' جو چاہے کرے)''۔

یہ ہے اس سورۂ مبارکہ کا پہلا حصہ جس کے بارے میں حدیثِ قدسی کے حوالے سے یہ بتایا جا چکا ہے کہ ان کلمات کی تاثیر کا یہ عالم ہے کہ اِدھر بندہ کہتا ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ اور اگر یہ دل سے نکلے ہوئے الفاظ ہوں تو فوراً اللہ تبارک وتعالیٰ جواب میں ارشاد فرماتا ہے: ''میرے بندے نے میرا شکر ادا کیا''۔ اور جب بندہ کہتا ہے ''الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' تو اللہ تعالیٰ جواب میں فرماتا ہے: ''میرے بندے نے میری ثناء کی''۔ جب بندہ کہتا ہے: ''مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ'' تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''میرے بندے نے میری بڑائی کا اعلان کیا اور میری عظمت بیان کی''۔

## لفظ ''اللہ'' کی تحقیق

اس پوری بحث میں ایک دقیق لغوی وعلمی مسئلے کو جان بوجھ کر نہیں چھیڑا گیا' اور وہ ہے لفظ ''اللہ'' کی تحقیق۔ تاہم مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بارے میں چند بنیادی باتیں عام فہم انداز میں بیان کر دی جائیں۔

لغوی اعتبار سے لفظ ''اللہ'' کے بارے میں دو آراء ہیں۔ ایک یہ کہ یہ اسم جامد اور اسم علم ہے' یعنی نہ اس کا کوئی مادہ ہے' نہ یہ کسی اور لفظ سے بنا ہے' بلکہ یہ اسمِ ذات ہے اُس ہستی کا جس نے اس سلسلۂ کون ومکان کو تخلیق فرمایا۔ لہٰذا اصل ضرورت اس اسم ہی کو حرزِ جاں بنانے اور دل پر کندہ کرنے کی ہے نہ کہ اس کے معنی کے کھوج کرید کی۔ دوسری رائے یہ ہے کہ یہ بھی باری تعالیٰ کے بقیہ تمام اسماءِ حُسنیٰ کے

مانند صفاتی نام ہے اور لفظ ''الٰہ'' پر لام تعریف داخل کر کے بنا ہے اور اس کے معنی ہیں الٰہ حقیقی اور معبودِ برحق!

پھر خود ''الٰہ'' کے مادے کی تحقیق بھی ایک دقیق اور طوالت طلب معاملہ ہے' لیکن تین مفہوموں پر تقریباً اجماع ہے۔ ایک وہ ہستی جس کی طرف حاجت روائی اور مشکل کشائی کے لیے رجوع کیا جائے' دوسرے وہ ہستی جس کے بارے میں عقل حیران اور سرگشتہ ہو کر رہ جائے' اور تیسرے وہ ہستی جس سے والہانہ محبت ہو۔ اور اگر ذرا غور کیا جائے تو صاف نظر آ جائے گا کہ عوام الناس کی رسائی اکثر و بیشتر صرف پہلے مفہوم تک ہوتی ہے' جبکہ فلاسفہ کا تحیر اور لاادریت دوسرے مفہوم کے مظہر ہیں اور صوفیاء تیسرے اور بلند ترین مفہوم سے سرشار ہوتے ہیں۔ واللہ اعلم!!

# جزوِ ثانی: عبادت اور استعانت

اس سورۂ مبارکہ کا جزوِ ثانی ایک آیت پر مشتمل ہے۔ اور جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے' یہ ہر اعتبار سے اس سورت کی مرکزی آیت ہے' یعنی:

﴿اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ؕ﴾

یہاں پہلی بات یہ نوٹ فرمایئے کہ اس آیت میں دو فعل استعمال ہوئے ہیں' ایک ''نَعۡبُدُ'' اور دوسرا ''نَسۡتَعِیۡنُ''۔ یہ دونوں فعل مضارع ہیں۔ آپ کے علم میں ہو گا کہ اردو کی طرح عربی و فارسی میں فعل کی تین حالتیں ماضی' حال اور مستقبل نہیں ہوتیں' بلکہ صرف دو حالتیں ہوتی ہیں' ایک ماضی اور دوسری مضارع' اور فعل مضارع میں حال اور مستقبل دونوں زمانے شامل ہوتے ہیں' لہٰذا نَعۡبُدُ کا ترجمہ یہ بھی ہو گا کہ ''ہم بندگی کرتے ہیں'' اور یہ بھی ہو گا کہ ''ہم بندگی کرتے رہیں گے''۔ اسی طرح نَسۡتَعِیۡنُ کا ترجمہ یہ بھی درست ہو گا کہ ''ہم مدد مانگتے ہیں'' اور یہ بھی صحیح ہو گا کہ ''ہم مدد مانگیں گے''۔

دوسری بات یہ نوٹ کر لیجیے کہ اگر یہاں ''نَعۡبُدُکَ'' کا لفظ ہوتا تو اس کے معنی ہوتے کہ ''ہم تیری بندگی کرتے ہیں اور کریں گے''۔ لیکن چونکہ ضمیر مفعولی ''کَ'' کو فعل

سے پہلے لایا گیا اور اس کے لیے ''اِیَّا '' کا اضافہ کیا گیا' یعنی ''اِیَّاكَ نَعۡبُدُ'' تو اس میں ایک مزید تاکیدی مفہوم پیدا ہوگیا اور وہ یہ کہ ''ہم صرف تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے''۔اس کو قواعد کی رو سے حصر کا اسلوب کہا جاتا ہے۔اس کو اس مثال سے سمجھا جا سکتا ہے کہ اگر یہ کہا جائے کہ ''زید عالم ہے'' تو اس سے ایک خاص مفہوم ذہن میں آئے گا' لیکن اگر یہ کہا جائے کہ ''زید ہی عالم ہے'' تو اس ''ہی'' کے اضافے سے مفہوم میں عظیم فرق واقع ہو جائے گا۔اس لیے کہ جب یہ کہا گیا کہ ''زید عالم ہے'' تو دوسروں کے عالم ہونے کی نفی نہیں ہوئی۔گویا دوسرے بھی عالم ہو سکتے ہیں۔لیکن جب یہ کہا گیا کہ ''زید ہی عالم ہے'' تو اس میں حصر پیدا ہوگیا اور اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ ''علم'' صرف زید ہی کے پاس ہے' دوسروں سے ''علم'' کی نفی ہوگئی۔لہٰذا ''اِیَّاكَ نَعۡبُدُ'' میں اسی حصر کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔اس کا ترجمہ اور حقیقی مفہوم ہوگا: ''ہم صرف تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے''۔اسی طرح ''اِیَّاكَ نَسۡتَعِیۡنُ'' کا مفہوم ہوگا: ''ہم صرف تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں اور مانگیں گے''۔

تیسری بات یہ کہ اس آیت کا مرکزی لفظ ''عبادت'' ہے جس کا ہم اقرار بھی کر رہے ہیں اور عہد بھی کر رہے ہیں۔اس لیے کہ ''ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں'' یہ اقرار ہے یا اظہارِ واقعہ ہے۔اور ''ہم تیری ہی عبادت کرتے رہیں گے'' یہ ایک وعدہ' قول وقرار اور عہد و میثاق ہے۔

چوتھی اہم بات یہ ہے کہ عبادت کا حقیقی معنی و مفہوم کیا ہے؟ بدقسمتی سے اس لفظ عبادت کے بارے میں عوام الناس کے ذہنوں میں بڑا محدود تصور پایا جاتا ہے اور عام خیال یہ ہے کہ عبادت بس نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ کا نام ہے۔چنانچہ جب بھی عبادت کا لفظ سامنے آتا ہے ذہن لامحالہ صرف ان عبادات ہی تک محدود ہوکر رہ جاتا ہے اور اس لفظ کی اصل عظمت اور وسعت سامنے نہیں آتی۔اس لیے جان لیجیے کہ اس لفظ عبادت کا مادہ ''ع ب د'' ہے اور ''عبد'' غلام کو کہتے ہیں۔غلامی کا وہ تصور جو کبھی دنیا میں رائج تھا' وہ سامنے ہو تب اس لفظ کی اصل حقیقت سمجھ میں آتی ہے۔جو شخص کسی کا عبد یعنی غلام

ہوتا تھا وہ اپنے آقا کی ملکیت ہوتا تھا۔ اس کا کام اپنے مالک کے احکام کو بجالانا ہوتا تھا۔ آقا جو حکم دیتا تھا غلام کا فرض تھا کہ وہ بسر وچشم اس کی تعمیل کرے۔ اس کی اپنی کوئی مرضی نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے کہ غلام تو مملوک ہوتا تھا' اس کا کام تو اپنے آقا کی مرضی پر چلنا تھا۔ اس کی پسند اور ناپسند اوّل تو رہنی ہی نہیں چاہیے تھی' اور اگر رہتی بھی تو اس کا فرض تھا کہ اسے پس پشت ڈال دے اور اپنے آقا کی پسند و ناپسند اور مرضی و ناراضی کو مقدم رکھے۔ پس معلوم ہوا کہ لفظ ''عبد'' میں جو تصور مضمر ہے وہ مکمل اور ہمہ تن' ہمہ وقت اور ہمہ جہت غلامی کا تصور ہے۔ فارسی میں اس کے لیے بہترین لفظ ''بندگی'' ہے۔ چنانچہ عبد کے مفہوم کے لیے بندہ کا لفظ عام طور پر مستعمل ہے۔ جیسے علامہ اقبال نے فرمایا ع

''تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے!''

یعنی یہ کہ انسانوں ہی میں سے کوئی آقا بن جائے اور کوئی بندہ' تو اس سے زیادہ غلط اور خلافِ انسانیت بات اور کوئی نہیں! اس کے برعکس نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''اے لوگو! تم سب اللہ کے بندے اور آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ''۔ تم سب اللہ کے بندے ہو' اس اعتبار سے برابر ہو' بھائی بھائی ہو' تم میں سے کوئی آقا اور غلام ہے ہی نہیں۔ حقیقی آقا اللہ ہے اور تم سب اس کے غلام ہو۔

بندگی کے اس ہمہ گیر تصور کو سامنے رکھ کر اس حقیقت کی جانب توجہ کی جائے تو پانچویں اہم بات یہ سامنے آئے گی کہ از روئے قرآن مجید غایتِ تخلیقِ جن وانس یہی عبادتِ ربّ ہے۔ چنانچہ سورۃ الذّٰریٰت میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝۵۶﴾ ''میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں''۔ یہ ہے ہماری غایتِ تخلیق۔ قرآن کریم کی اس آیت کی ترجمانی بڑی خوبصورتی سے شیخ سعدی رحمہ اللہ نے اس شعر میں کی ہے جو بہت سی مسجدوں میں لکھا ہوتا ہے کہ ؎

زندگی آمد برائے بندگی
زندگی بے بندگی شرمندگی

چھٹی قابل غور بات یہ ہے کہ کوئی شے جس مقصد کے لیے بنائی گئی ہو وہ اگر اس مقصد ہی کو پورا نہ کرے تو ظاہر بات ہے کہ وہ بے کار قرار پائے گی اور ہم اسے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر پھینک دیں گے۔ لہٰذا جب انسان کی تخلیق ہوئی ہی بندگی کے لیے ہے تو اگر وہ بندگی کی روش کو اختیار نہ کرے یا اسے تج دے اور ترک کر دے تو معلوم ہوا کہ اس کے وجود کا اب کم از کم انسانی سطح پر کوئی مقصد نہیں رہا' اور اس کی زندگی محض حیوانی سطح کی زندگی ہے یا شاید اس سے بھی کم تر!

اس ضمن میں ساتویں اہم بات یہ ہے کہ جب ہم اللہ سے عہد کرتے ہیں کہ ''ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے'' تو یہ ایک بہت بڑا عہد ہے اور اس کے بہت سے تقاضے ہیں' جن کو سمجھے اور جانے بغیر عبادت کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ (یاد رہے کہ یہ باتیں ہمارے سامنے شرک فی العبادت کی بحث کے ضمن میں پہلے بھی آ چکی ہیں۔ یوں سمجھئے کہ اب ان کا ایک دوسرے سیاق وسباق میں اعادہ ہو رہا ہے)

عبادت کا سب سے پہلا تقاضا اطاعت ہے۔ اگر یہ نہیں ہے تو عبادت کی اساس ہی منہدم ہو جاتی ہے۔ پھر بندگی کہاں ہوئی؟ مزید برآں اطاعت اگر کُلّی نہ ہو' بلکہ جزوی ہو تب بھی عبادت کی نفی ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ کسی غلام کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ اپنے آقا کے ایک حکم کو مانے اور ایک کو نہ مانے۔ غلام نے اگر آقا کے ایک حکم سے بھی سرتابی کی تو وہ مقامِ بندگی سے تجاوز کر گیا۔ لہٰذا اطاعت لازم ہے تمام احکامِ خداوندی کی' ہر آن اور ہر لحظہ! اور زندگی کا کوئی گوشہ بندگی سے خارج یا مستثنیٰ نہیں رہے گا۔ اسی لیے قرآن مجید میں فرمایا گیا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَاۗفَّةً﴾ (البقرۃ: ۲۰۸) ''اے اہل ایمان! (اطاعت اور) فرمانبرداری میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ''۔ گویا جزوی اطاعت مطلوب نہیں ہے کہ اللہ کی کچھ باتوں پر تو سر تسلیم خم ہو اور کچھ باتوں سے انحراف کیا جائے۔ اس پر اللہ کا غضب بہت بھڑکتا ہے۔ چنانچہ سورۃ البقرۃ کی آیت ۸۵ میں اس طرزِ عمل پر بڑی سخت وعید آئی ہے۔ فرمایا:

﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَاۗءُ مَنْ يَّفْعَلُ

ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۵﴾

''کیا تم ہماری کتاب (اور ہماری شریعت) کے بعض حصوں کو مانتے ہو اور کچھ حصوں کو نہیں مانتے؟ تو جو کوئی تم میں سے اس جرم کا ارتکاب کرے گا اس کی سزا اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اسے دنیا کی زندگی میں ذلیل وخوار کر دیا جائے' اور قیامت کے دن انہیں شدید ترین عذاب میں جھونک دیا جائے گا' اور اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے جو تم کرتے ہو''۔

یہ ہے جزوی اطاعت پر اللہ تعالیٰ کے غیظ وغضب کا عالم! اس لیے کہ جزوی اطاعت حقیقت کے اعتبار سے استہزاء اور تمسخر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس آیت کے آخر میں فرمایا: ''اور اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو''۔ اس گمان میں نہ رہنا کہ وہ تمہارے کرتوتوں سے واقف نہیں ہے' بلکہ وہ تو العلیم' البصیر' اللّطیف اور الخبیر ہے۔ اس سے تمہارا کوئی عمل پوشیدہ نہیں ہے۔

آٹھویں اور اہم ترین بات یہ ہے کہ ایک اطاعت ہوتی ہے زبردستی کی' جیسے ہم انگریز کے غلام تھے اور ہم اس کی اطاعت پر مجبور تھے۔ اس اطاعت پر بھی لغوی طور پر لفظ عبادت کا اطلاق ہو جائے گا اور قرآن مجید میں ہوا ہے۔ چنانچہ آلِ فرعون نے بنی اسرائیل کو جس طریقے سے اپنی غلامی کے شکنجے میں کسا ہوا تھا' اس کے لیے قرآن مجید میں یہی لفظ عبادت آیا ہے۔ فرعون نے بڑے طنطنے اور غرور کے ساتھ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے بارے میں کہا تھا: ﴿...... وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ﴿۴۷﴾﴾ (المؤمنون) ''......جبکہ ان دونوں کی قوم ہماری عابد ہے'' یعنی ہماری غلام ہے۔ اسی طرح ایک موقع پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی فرعون سے فرمایا تھا: ﴿......اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴾ ''......کہ تو نے بنی اسرائیل کو اپنا عبد (اپنا غلام' اپنا محکوم اور مطیع) بنا لیا ہے''۔ لہٰذا اس نوع کی غلامی اور محکومی پر بھی لفظاً تو عبادت کا اطلاق ہو جائے گا لیکن اصطلاحاً اللہ کی جو عبادت مطلوب ہے۔ وہ زبردستی اور مجبوری کی اطاعت نہیں' بلکہ دلی آمادگی اور محبت کے ساتھ مطلوب ہے' اللہ کے احسانات وانعامات کا شعور وادراک

کرتے ہوئے کہ اس کے جذبۂ تشکّر سے قلب و ذہن سرشار ہو جائیں‘ ان احساسات و جذبات کے ساتھ جب اللہ کی بندگی ہوگی‘ اس کی کامل اطاعت ہوگی تب عبادت کا اصل تقاضا پورا ہوگا‘ جس کو ہمارے ائمۂ دین نے بڑی خوبصورتی سے یوں ادا فرمایا کہ اللہ کی جو عبادت مطلوب ہے‘ اس میں دو بنیادیں جمع ہونی چاہئیں: **غَايَةَ الحُبّ مع غاية الذُّلّ وَالخُشوع** یعنی ایک طرف اللہ کی انتہا درجہ کی محبت ہو اور دوسری طرف انتہا درجے میں اس کے سامنے تذلّل اور عاجزی اختیار کی جائے‘ اس کے سامنے ہمہ تن جھک جایا جائے‘ بچھ جایا جائے۔ جب یہ دونوں کیفیات۔ محبت اور تذلل۔ جمع ہو جائیں گی تو عبادتِ ربّ اور بندگیٔ ربّ کے تقاضے کی تکمیل ہوگی۔ محبتِ الٰہی عبادت کے لیے کس قدر لازمی ہے‘ مولانا رومؒ نے اسے اپنے زمانے میں بڑی خوبی سے ادا کیا تھا کہ: ؎

شاد باد اے عشقِ خوش سودائے ما
اے طبیبِ جملہ علّت ہائے ما

اور اس دَور میں علامہ اقبال مرحوم نے اس کی اہمیت پر بڑی خوبصورتی سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ: ؎

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اوّلیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

محبتِ الٰہی عبادت کی روح ہے۔ اگر یہ روح نہیں ہے اور صرف خالی خولی اطاعت ہے‘ دل کی محبت کی چاشنی اس میں شامل نہیں ہے تو علامہ اقبال کے بقول معاملہ یہ ہوگا کہ: ؎

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام!
میرا قیام بھی حجاب‘ میرا سجود بھی حجاب

لہٰذا ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ محبت درحقیقت عبادت کی روح ہے۔

نویں بات یہ ہے کہ عبادت میں اطاعتِ کُلی و محبتِ حقیقی کے ساتھ جو تیسری چیز

مطلوب ہے وہ اخلاص ہے۔ اس سے قبل سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کے درس کے ضمن میں اقسامِ شرک کی بحث میں بھی یہ بات واضح ہو چکی ہے۔ آج پھر اس کا اعادہ کر لیجیے۔ عبادت کی قبولیت کی شرطِ لازم اخلاص ہے' یعنی اللہ کی بندگی پورے خلوص و اخلاص کے ساتھ ہونی چاہیے۔ اس میں کوئی ریاکاری نہ ہو اور اللہ کی رضا کے سوا کوئی اور چیز مطلوب و مقصود کے درجے میں نہ آ جائے۔ مطلوب صرف اللہ کی رضا اور اُخروی فلاح و نجات ہو۔ اگر یہ اخلاص و للّٰہیت موجود نہیں ہے' بلکہ کوئی ریاکاری ہے' یعنی لوگوں پر اپنی عبادت گزاری اور اپنے زہد و تقویٰ کی دھونس جمانی ہے اور اپنی نیکی کا رعب قائم کرنا ہے' یا شہرت مطلوب ہے' یا دنیا کی کوئی منفعت پیش نظر ہے تو یہ خلوص سے خالی عبادت اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول نہیں ہوگی' بلکہ' جیسا کہ اس سے قبل واضح ہو چکا ہے' شرکِ خفی شمار ہوگی۔ جیسے ''اقسامِ شرک'' کی بحث میں نبی اکرم ﷺ کی حدیث بیان ہو چکی ہے کہ ''جس نے دکھاوے کے لیے نماز پڑھی وہ شرک کر چکا' جس نے دکھاوے کے لیے روزہ رکھا وہ شرک کر چکا' جس نے دکھاوے کے لیے صدقہ کیا وہ شرک کر چکا''۔ اس حدیث سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہمارے دین میں خلوص و اخلاص کی کس قدر اہمیت ہے اور ریا کی کتنی مذمت ہے کہ اس کے ڈانڈے شرک سے مل جاتے ہیں۔

اب آخری اور دسویں بات پر غور کیجیے کہ پوری زندگی میں پورے خلوص و اخلاص' شدید ترین قلبی محبت اور کامل اطاعت کے ساتھ عبادت کا حق ادا کرنا' واقعہ یہ ہے کہ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے' بلکہ بہت مشکل کام ہے۔ اس میں سب سے پہلے تو انسان کا اپنا نفس ہی آڑے آتا ہے۔ مولانا روم نے کیا خوب کہا ہے کہ: ؎

نفسِ ما ہم کمتر از فرعون نیست
لیکن اُو را عون ایں را عون نیست

فرعون کے پاس حکومت تھی' لاؤ لشکر تھا' اس لیے اس نے زبان سے بھی خدائی کا دعویٰ کر دیا تھا۔ میرا نفس بھی اگرچہ فرعون سے کمتر نہیں ہے' البتہ اس کے پاس لاؤ لشکر نہیں

ہے اس لیے وہ خدائی کا زبانی دعویٰ تو نہیں کرتا لیکن اندر سے وہ کہتا یہی ہے کہ میں نہیں جانتا کہ اللہ کا حکم کیا ہے! بلکہ میری مرضی چلے گی۔ خود غور کیجیے کہ اذان کی آواز کان میں آ گئی ہے' گویا اللہ کا حکم ہے کہ نماز کے لیے آؤ۔ اِدھر نفس کہہ رہا کہ ابھی مزید سوتے رہو' مزید آرام کرو' یا جس دلچسپی میں مصروف ہو اسے جاری رکھو۔ اب فیصلہ کُن بات یہ ہو گی کہ ہم نے کس کا حکم مانا! اگر نفس کی خواہش کو کچلتے ہوئے ہم نے اللہ کا حکم مانا اور نماز کے لیے نکل کھڑے ہوئے تو واقعی ہم بندۂ ربّ ہیں۔ اگر نفس کی خواہش پر عمل کیا اور اللہ کے حکم کو پس پشت ڈال دیا تو ہم بندۂ نفس ہو گئے۔ یہی بات سورۃ الفرقان میں فرمائی گئی ہے:

﴿اَرَءَیۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـہَہٗ ہَوٰىہُ ؕ اَفَاَنۡتَ تَکُوۡنُ عَلَیۡہِ وَکِیۡلًا ﴿۴۳﴾﴾

''(اے نبیؐ!) کیا آپ نے اُس شخص کی حالت پر غور کیا جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا معبود بنا لیا؟ تو کیا آپ ایسے شخص کا ذمہ لے سکتے ہیں؟''

اسی حقیقت کو علامہ اقبال نے یوں ادا کیا: ؎

چو می گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را

یعنی ''میں جب یہ کہتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں تو مجھ پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے' اس لیے کہ مجھے معلوم ہے کہ لا الٰہ الاّ اللہ کے تقاضوں پر پورا اترنا کتنا مشکل ہے!''

یہ ہے ربط و تعلق کہ جب بندہ کہے: ''اِیَّاکَ نَعۡبُدُ'' تو اس پر ایک لرزہ طاری ہو جائے' اسے پورا احساس اور کامل شعور ہو کہ وہ کتنا بڑا قول و قرار کر رہا ہے۔ اس کیفیت میں اسے پناہ گاہ نظر آئے گی ''وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ'' کے الفاظِ مبارکہ میں کہ اے اللہ! میں یہ وعدہ اور عہد تو کر رہا ہوں اور میں نے ارادہ اور عزم بھی کر لیا ہے کہ پوری زندگی تیری عبادت میں بسر کروں گا' لیکن میں محض اپنی قوت اور طاقت کے بل پر اس ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا اور اس عہد پر پورا نہیں اتر سکتا جب تک کہ تیری مدد شاملِ حال نہ ہو۔ میں اس عہد کے پورا کرنے میں تیری

اعانت اور تائید و توفیق کا محتاج ہوں۔ تیری اعانت اور مدد شامل ہوئی تب ہی میں اس قول و قرار اور عہد و پیمان کو پورا کرسکوں گا۔ یہ تو ہے اصل ربط و تعلق ''اِيَّاكَ نَعْبُدُ'' کے ساتھ ''اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ'' کا۔ اضافی طور پر اس میں اخلاص فی الدّعاء کا مضمون بھی آ گیا' اس لیے کہ یہاں بھی حصر کا اسلوب ہے۔ گویا ہر نوع کی حاجت روائی اور مشکل کشائی کے لیے اللہ ہی سے مدد کی درخواست کی جائے' اسی سے اعانت طلب کی جائے' اسی کے جناب میں استغاثہ پیش کیا جائے۔ یہ توحید فی الدّعاء ہے' جس کا ذکر اس سے قبل اقسامِ شرک کی بحث کے ضمن میں ہو چکا ہے۔

اسی آخری بات کے ضمیمے کے طور پر یہ بات بھی نوٹ فرما لیجیے کہ ہر فرض نماز کے بعد جو اذکار نبی اکرم ﷺ کے معمول میں شامل تھے' ان میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی آپ ﷺ کی یہ دعا بھی منقول ہے: ((رَبِّ اَعِنِّیْ عَلٰی ذِکْرِكَ وَشُکْرِكَ وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ))[1] ''اے پروردگار! میری مدد فرما تاکہ میں تجھے یاد رکھ سکوں' تیرا شکر ادا کرسکوں اور تیری عبادت کا با حسن وجوہ حق ادا کرسکوں''۔

# جزوِ ثالث: درخواستِ ہدایت

سورۃ الفاتحہ کا تیسرا حصہ اگرچہ تین آیات پر مشتمل ہے تاہم ان سے جملہ ایک ہی بنتا ہے۔ آیئے پہلے ان تین آیاتِ مبارکہ اور ان کے ترجمے پر ایک نظر ڈال لیں:

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۵ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝﴾ (آمین یا ربّ العالمین)

''(اے ربّ ہمارے!) ہمیں ہدایت بخش سیدھی راہ کی' راہ اُن لوگوں کی جن پر تیرا انعام ہوا' جو نہ تو مغضوب ہوئے اور نہ گمراہ''۔ (اے تمام جہانوں کے مالک! ایسا ہی ہو)

پہلی تین آیات پر تدبّر سے ہم پر یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ ایمان باللہ یا توحید

(۱) سنن النسائی' کتاب السهو' باب نوع آخر من الدعاء۔

اور ایمان بالآخرۃ یا معاد تک ایک سلیم الفطرت اور سلیم العقل انسان فطرت و عقل کی رہنمائی میں از خود بھی رسائی حاصل کر سکتا ہے جس کے نتیجے میں اس کے باطن میں ایک بے پناہ جذبۂ تشکّر پیدا ہو جاتا ہے۔ چوتھی آیت سے معلوم ہوا کہ اسی جذبۂ تشکر سے جذبۂ عبادت اُبھرتا ہے۔ اس سے آگے واقعہ یہ ہے کہ عقلِ انسانی خود اپنی محدودیت اور نارسائی کا اعتراف کرتی ہے کہ جہاں تک صراطِ مستقیم یعنی زندگی بسر کرنے کے معتدل و متوازن طریقے کا تعلق ہے' وہاں انسانی عقل بے بس اور محتاجِ ہدایت ہے۔ چنانچہ یہ ہے وہ مقام جہاں بندہ سراپا احتیاج بن کر ایک استدعا اور ایک درخواست اپنے مالک کے حضور پیش کرتا ہے کہ اے ربّ! ہماری رہنمائی فرما' یعنی ہمیں دکھا اور چلا اُس راستہ پر جس میں کوئی کجی نہ ہو' کوئی ٹیڑھ نہ ہو' افراط و تفریط کے دھکے نہ ہوں' جو ہمیں سیدھا تیری رضا تک پہنچانے والا اور آخرت کی کامیابی و کامرانی اور فوز و فلاح سے ہمکنار کرنے والا ہو۔

''ہدایت'' عربی زبان کا ایک نہایت وسیع المفہوم لفظ ہے۔ اس میں یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ راستہ دکھا دیا جائے' بتا دیا جائے' سجھا دیا جائے' یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ اس راستے پر ذہن اور قلب کو مطمئن کر دیا جائے' اور یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ انگلی پکڑ کر اس راستے پر چلایا جائے اور بالآخر و بالفعل منزلِ مراد تک پہنچا دیا جائے۔ یہ ہدایت کے مختلف مراحل ہیں۔ سورۂ محمد (ﷺ) میں فرمایا گیا: ﴿وَالَّذِیْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّاٰتٰىهُمْ تَقْوٰىهُمْ ﴿۱۷﴾﴾ ''اور وہ لوگ جو ہدایت کے راستہ پر آئے اللہ نے ان کی ہدایت میں اضافہ کر دیا اور انہیں ان کے حصہ کا تقویٰ عطا فرما دیا''۔ اسی طرح سورۂ مریم میں فرمایا گیا: ﴿وَيَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى ط﴾ (آیت ۷۶) ''اور اللہ ان لوگوں کی ہدایت میں اضافہ فرماتا ہے جو ہدایت اور راست روی کا راستہ اختیار کرتے ہیں''۔ یہ ہدایت مسلسل بڑھتی چلی جاتی ہے' اس میں ترقی ہوتی چلی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے تمام مدارج و مراحل مؤمنین صادقین کو طے کرا دیتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنی منزلِ مراد تک جا پہنچتے ہیں اور جنت میں داخلے کے

وقت ان کی زبانوں پر یہ ترانہ حمد جاری ہو جاتا ہے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۣ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ﴾ (الاعراف:۴۳) ''تمام شکر و سپاس اور کُل تعریف وثناء اللہ ہی کے لیے ہے جس نے ہمیں راستہ دکھایا اور ہمیں یہاں تک پہنچا دیا' اور ہم خود ہرگز راہ یاب نہ ہو سکتے اگر اللہ ہی ہماری رہنمائی نہ فرماتا''۔ واضح رہے کہ یہی عقلی بنیاد ہے ایمان بالرسالت کی' کیونکہ ہدایتِ الٰہی رسولوں ہی کے واسطے سے بنی نوعِ انسان تک پہنچتی ہے۔ چنانچہ سورۃ الاعراف کی اس آیت کے آخر میں کامیاب و بامراد مؤمنین کا یہ قول بھی نقل ہوا ہے: ﴿لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ؕ﴾ ''ہمارے ربّ کے رسول واقعی حق لے کر ہی تشریف لائے تھے''۔

یہاں یہ مغالطہ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ شخص جو بنیادی حقائق تک خود پہنچ چکا ہے' جس نے اللہ کو پہچان لیا' اس کی توحید کو جان لیا' اس کی صفاتِ کمال کی معرفت حاصل کر لی' اس کی ربوبیت' رحمانیت ورحیمیت کا ادراک وشعور حاصل کر لیا' اس کے مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ہونے کا اقرار کر لیا' پھر اس کی بندگی اور پرستش کا عہد و پیمان کر لیا تو اسے تو گویا کُل ہدایت حاصل ہوگئی۔ اب اسے کون سی مزید ہدایت مطلوب ہے جس کے لیے وہ دعا کر رہا ہے کہ ''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ''۔ یہاں انسان کی جس احتیاج کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ انسان اس دُنیوی زندگی کے مختلف معاملات میں جو نہایت پیچیدہ ہیں اور ان مسائل میں جو باہم گتھے ہوئے ہیں' ایک اعتدال کی روش اور ایک متوازن طرزِ عمل کا محتاج ہے اور اس کی یہ احتیاج ہمیشہ باقی رہے گی' اس لیے کہ تمدن کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ ان مسائل ومعاملات کی پیچیدگیاں بھی مسلسل بڑھتی چلی جاتی ہیں اور حیاتِ انسانی کی یہ پیچیدگیاں اور ان کے گوناگوں تقاضے اور مطالبے اور ان کا آپس میں ٹکراؤ اور تصادم' یہ عقدہ ہائے لاینحل ہیں' اور کسی انسان کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ مجرد اپنی عقل اور تجربے کی بنیاد پر اِن جملہ سماجی ومعاشرتی اور سیاسی ومعاشی

مسائل کا متوازن و معتدل اور عادلانہ و منصفانہ حل تلاش کر سکے' جس پر چل کر وہ حیاتِ دُنیوی کی برکتوں اور سعادتوں سے بھی پُرسکون طور پر ہمکنار ہو سکے' اور حیاتِ اُخروی میں بھی نجات اور فوز و فلاح حاصل کر سکے۔ یہ ہے درحقیقت انسان کی اہم ضرورت جس کے لیے سلسلۂ نبوت و رسالت اور انزالِ وحی و کتب کی ضرورت پیش آئی۔ اور یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ جہاں تک ایمان کے بنیادی تصورات کا تعلق ہے وہاں تک پہنچنے کے لیے انسان اپنی عقل اور فطرت سے بھی رہنمائی حاصل کر سکتا ہے' جیسا کہ سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کے ذریعے یہ حقیقت ہمارے سامنے آ چکی ہے کہ انسان اپنی فطرتِ صحیحہ اور عقلِ سلیم کی رہنمائی میں توحید اور معاد تک رسائی حاصل کر سکتا ہے' لیکن زندگی کی پُر پیچ وادیوں میں سیدھی راہ کی تلاش' یہ انسان کے بس میں نہیں ہے۔ اس کے لیے وہ مجبور ہے کہ گھٹنے ٹیک کر اپنے مالک سے ہدایت کی درخواست کرے' اس لیے کہ واقعہ یہ ہے کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں اور یہی واحد ممکن راستہ ہے۔

اس بات کو انسانی تمدن کے چند پیچیدہ مسائل کی مثال سے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں اوّلین اور قدیم ترین مسئلہ یہ ہے کہ مرد اور عورت کے مابین حقوق و فرائض کا صحیح توازن کیا ہے۔ ہر باشعور انسان جانتا ہے کہ اس معاملے میں تاریخ انسانی میں شدید افراط و تفریط نظر آتی ہے۔ کسی معاشرے میں عورت بالکل بھیڑ بکری کی طرح ایک مملوکہ کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کے برعکس کہیں ہم دیکھتے ہیں کہ وہی عورت قلوپطرہ بن کر کسی ملک کی تقدیر کا فیصلہ کر رہی ہے اور اس کے لیے تباہی اور بربادی کا سامان فراہم کر رہی ہے۔ لہٰذا مرد اور عورت کے درمیان توازن و اعتدال اور عدل و انصاف عقل انسانی کے بس میں نہیں ہے۔ اس لیے کہ انسان لازماً مرد ہو گا یا عورت' اور ان میں سے ہر ایک صرف اپنی ہی مصلحتوں اور مفادات کو مدّنظر رکھنے پر مجبور ہے۔ گویا یہاں انسان اس فاطرِ فطرت کی رہنمائی کا محتاج ہے جس نے مرد کی تخلیق بھی کی ہے اور عورت کی بھی۔ جو دونوں کے عواطف اور

میلانات کو بتمام وکمال جاننے والا ہے' جو تہذیب وتمدن میں دونوں کے حقوق و فرائض کا ایسا صحیح صحیح تعین کرسکتا ہے جس کی بدولت انسانی تمدن کی گاڑی دونوں پہیوں پر ہمواری کے ساتھ سیدھی راہ پرآگے بڑھ سکے۔

دوسری مثال فرد اور اجتماعیت کے باہمی تعلق وتوازن سے متعلق ہے۔ اگر افراد کی انفرادی آزادی پر حدِّ اعتدال سے زیادہ زور ہوتا ہے اور ان کے حقوق کا ضرورت سے زیادہ لحاظ رکھا جاتا ہے تو پلڑا ایک جانب جھک جاتا ہے اور مادر پدر آزادی انتشار اور انارکی کا روپ دھار لیتی ہے۔ اس کے برعکس کہیں ایسا ہوتا ہے کہ اجتماعیت اس طور پر مسلط ہو جاتی ہے کہ اس کے نیچے فرد سسکنے لگتا ہے اور اس کے حقوق بالکل پامال ہو جاتے ہیں۔ اس کی آزادی اور حریت کو اجتماعیت کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔ ان دو انتہاؤں کے مابین توازن قائم رکھنا نہایت کٹھن ہے اور واقعہ یہ ہے کہ عقل انسانی اس کی صلاحیت نہیں رکھتی کہ وہ ایسے صحیح نقطۂ عدل کا تعین کر سکے کہ فرد کے حقوق بھی برقرار رہیں' اس کی انفرادی شخصیت کے صحت مند ارتقاء کے امکانات بھی روشن رہیں' لیکن اس کے ساتھ ساتھ فرد معاشرے کے لیے ایک مضر اور نقصان دہ عنصر کی حیثیت اختیار نہ کر سکے' بلکہ ان دونوں کے مابین ایک مبنی بر عدل اور کامل توازن والا نظام قائم ہو سکے۔ عمرانیات کی تاریخ سے ادنیٰ واقفیت رکھنے والے بھی اس سے واقف ہیں کہ انسانی عقل اور تجربات تاحال ایسا نظام قائم کرنے سے یکسر قاصر رہے ہیں اور ان کے تجویز کردہ نظام لازماً افراط وتفریط کا شکار رہے ہیں۔

یہی معاملہ معاشی مسائل کا بھی ہے جنہوں نے خاص طور پر صنعتی انقلاب کے بعد ایک نہایت گھمبیر اور لاینحل عقدے کی صورت اختیار کر لی ہے۔ یعنی یہ کہ سرمایہ اور محنت کے مابین صحیح توازن کیسے قائم کیا جائے اور اقتصادی معاملات میں عدل واعتدال کے تقاضے کیسے پورے کیے جائیں۔ اس معاملے میں نقطۂ عدل و قسط کی تلاش میں نوعِ انسانی کتنی سرگرداں ہے اور کیسے کیسے تجربے کر رہی ہے' وہ

روزِ روشن کی طرح ہمارے سامنے ہے۔ کہیں وہ انفرادی ملکیت کی نفیٔ کُلی کا تجربہ کرتی ہے جس سے انسان کی شخصی آزادی اور اس کی آزاد شخصیت کچل کر رہ جاتی ہے۔ کہیں ایسا ہوتا ہے کہ سرمایہ ایک بہت بڑے ڈکٹیٹر کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور ایک سرمایہ دارانہ آمریت معاشرے پر مسلط ہو جاتی ہے' جس میں امیر' امیر تر اور غریب' غریب تر ہوتا چلا جاتا ہے اور کسانوں اور مزدوروں کے لیے ایک باعزت اور آسودہ زندگی بسر کرنا محال ہو جاتا ہے۔

یہ ہیں وہ تین پیچیدہ اور اُمّہات المسائل جن کے گوناگوں شعبوں اور پیچ در پیچ شاخوں اور پھر ان کے متضاد تقاضوں کو ایک متوازن و معتدل نظام میں سمونے سے انسان قاصر ہے۔ اس لیے کہ ان کے حل کے لیے جب بھی انسان سوچے گا' اپنے قریبی ظروف و احوال میں رہ کر سوچے گا' اور اُن کا حل تلاش کرنے میں وہ اپنی ذات' گروہ یا طبقے سے بلند تر ہو کر معتدل اور منصفانہ راہ تلاش نہ کر پائے گا اور اس کی سوچ میں کہیں نہ کہیں کجی رہ جائے گی۔ اس کا جھکاؤ کسی نہ کسی طرف ہو جائے گا۔ نتیجتاً وہ صراطِ مستقیم اور سَوَاءَ السَّبِیۡل سے بھٹک جائے گا۔ قرآن مجید اس معتدل اور متوازن راستے کو مختلف ناموں سے تعبیر کرتا ہے۔ سورۃ الفاتحہ میں اسے صراطِ مستقیم کہا گیا ہے' یعنی سیدھا راستہ۔ کہیں اسے سَوَاءَ السَّبِیۡل کہا گیا ہے' کہیں صِرَاط السَّوِیّ کہا گیا ہے' یعنی برابری کا راستہ' جیسے خط استواء ہے جو ہمارے کرۂ ارضی کو دو برابر حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ پس سَوَاءَ السَّبِیۡل وہ راستہ ہو گا جس میں کامل توازن ہو' افراط و تفریط نہ ہو' کسی ایک جانب جھکاؤ نہ ہو جائے۔ کہیں اسے قَصۡدُ السَّبِیۡل سے تعبیر کیا گیا ہے' یعنی معتدل اور درمیانی راستہ جس میں نہ اونچ نیچ ہو نہ اونچ نیچ۔ کہیں اسے سَبِیۡلُ السَّلام کہا گیا ہے' یعنی سلامتی کا راستہ جس میں امن و سکون ہو' ظلم و عدوان نہ ہو' تعدّی و استحصال نہ ہو۔

یہ ہے درحقیقت انسان کی وہ احتیاج جس کے لیے وہ گھٹنے ٹیک کر اپنے پروردگار کے سامنے استدعا کرنے پر مجبور ہے کہ اے میرے ربّ! میں نے تجھے

پہچان لیا' تیری توحید کو جان لیا' ادنیٰ درجے ہی میں سہی لیکن مجھے تیری صفاتِ کمال کی معرفت بھی حاصل ہوگئی۔ میں نے یہ بھی جان لیا کہ مجھے مرنے کے بعد تیرے حضور میں حاضر ہونا ہے۔ میں یہ بھی جان چکا ہوں کہ اس دن کامل اختیار صرف تیرے ہاتھ میں ہوگا۔ میں نے یہ ارادہ اور عزم بھی کرلیا ہے کہ میں تیری ہی بندگی اور پرستش کروں گا اوراس کے لیے میں تیری ہی اعانت و امداد کامحتاج ہوں' لہٰذا اب میں تجھ سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ زندگی بسر کرنے کا صراطِ مستقیم' صِرَاط السَّوِیّ' سواءالسبیل اورسبیل السلام مجھ پر واضح فرما دے۔ مجھے اس کی ہدایت عطا فرما' اس کے لیے میرے دل کو اطمینان و انشراح بخش۔ مجھے اس پر چلنے کی توفیق دے اوراس پر چلاتے ہوئے مجھے میری کامیابی و کامرانی اور فوز و فلاح کی آخری منزل تک پہنچادے۔ واضح رہے کہ یہی ایمان بالرسالت کی عقلی بنیاد ہے' کیونکہ اس ہدایتِ ربّانی کو انسانوں تک پہنچانے کے منصبِ جلیل پر رسولوں کی مقدس جماعت فائز ہوتی رہی ہے اوراس سلسلۃ الذّہب کی آخری کڑی ہیں خاتم النبیین' سیّدالمرسلین' ہادیٔ آخرالزمان حضرت محمد رسول اللہ ﷺ۔

یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے کہ جس چیز کی اہمیت و وقعت زیادہ ہوتی ہے اسے مزید واضح کیا جاتا ہے' چنانچہ انسان کے دل میں جس چیز کی محبت ہوتی ہے وہ اس کا ذکر کثرت سے کرتا ہے۔ لہٰذا اس صراطِ مستقیم کی اہمیت پر زور دینے کے لیے اس کی مزید وضاحت خود اُسی کی زبان سے کرائی جارہی ہے کہ:

﴿اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ ۵﴾

''(اے ربّ) ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرما' ان لوگوں کے راستے کی جن پر تو نے انعام فرمایا''۔

یہ لوگ کون ہیں؟ اس سورۂ مبارکہ میں غایتِ اجمال و اختصار ہے۔ اس لیے یہاں ساری تفاصیل ممکن نہیں تھیں۔ لیکن قرآن مجید کی تفسیر کا یہ اصول پیش نظر رکھئے کہ اَلْقُرْآنُ يُفَسِّرُ بَعْضُهٗ بَعْضًا ''قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصے کی تفسیر

کرتا ہے''۔ اس کے مطابق اگر تلاش کیا جائے کہ ''اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ '' کی تفسیر قرآن مجید میں کہاں وارد ہوئی ہے تو سورۃ النساء کی یہ آیت سامنے آئے گی:

﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴿٦٩﴾﴾

''اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت پر کاربند ہو جائیں گے تو ان کو معیت اور رفاقت نصیب ہو گی ان کی جن پر اللہ کا انعام ہوا' یعنی انبیائے کرام' صدیقین' شہداء اور صالحین۔ اور بہت ہی اچھے ہیں یہ رفیق (جو کسی کو میسر آ جائیں)''۔

یہ چار گروہ ہیں مُنْعَمْ عَلَيْهِمْ کے۔ یہ ہیں وہ لوگ جن پر اللہ کا انعام وفضل ہوا' یہ ہیں وہ لوگ جن کو اللہ نے اپنی نعمتوں سے نوازا۔ ان میں انبیاء کرام علیہم السلام سب سے بلند اور سب سے اونچے مرتبے پر فائز ہیں۔ ان کے بعد درجہ ہے حضراتِ صدیقین کا۔ ان کے بعد تیسرے نمبر پر آتے ہیں شہدائے کرام' پھر چوتھے نمبر پر عام مؤمنین صالحین ہیں۔ اس موقع پر نوکِ قلم پر دعا آ رہی ہے کہ اے ربّ ہمارے! ہمیں اِن منعم علیہم کے راستے کی ہدایت بخش' ہمیں ان کے راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرما دے اور ہمیں ان کی رفاقت نصیب فرما! (آمین)

صراطِ مستقیم کی اس مثبت انداز میں وضاحت کے بعد ایک سلبی اور منفی انداز میں بھی وضاحت کی گئی:

﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ﴿٧﴾﴾

''جو نہ مغضوب علیہم میں شامل ہیں اور نہ ہی گم کردہ راہ ہیں''۔

درحقیقت یہ دو کیفیات یا دو درجات ہیں جنہیں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ ایک درجہ مغضوب علیہم کا ہے جو بہت ہی ناپسندیدہ ہے اور گویا ﴿ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا﴾ کا مصداق ہے۔ جب کوئی فرد یا کوئی قوم یا اُمت ہدایت کی راہ کو اپنے نفس کی شرارتوں کے باعث اور اپنی خواہشات وشہوات کا اتباع کرتے ہوئے جان بوجھ کر چھوڑ دے' صداقت وہدایت کی راہ سے جان بوجھ کر اعراض کرے' اس سے

مُنہ موڑے تو اُن کو قرآن ''مغضوب علیہم'' قرار دیتا ہے' یعنی جن پر اللہ کا غضب نازل ہوا۔ گویا جو لوگ حق کو حق اور باطل کو باطل جان کر بھی اپنے تعصّبات کی وجہ سے' یا اپنی خواہشاتِ نفس کی وجہ سے یا اپنے تکبر اور حسد کی بنیاد پر حق کو چھوڑ کر باطل کو اختیار کرتے ہیں تو وہ مغضوب علیہم ہیں۔

ایک دوسرا گروہ ان کا ہے جو مغالطّوں میں مبتلا ہو کر گمراہ ہو جاتے ہیں۔ اس معاملے میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے' جیسے ہم ''نیکی کی حقیقت'' کی بحث میں دیکھ چکے ہیں' کہ انسان غلط راستہ پر چل پڑتا ہے۔ اس کا کوئی اچھا جذبہ غیر معتدل ہو کر کسی غلط صورت میں ڈھل جاتا ہے۔ اس گروہ کے متعلق قرآن کہتا ہے: ''ضَآلِّیْنَ'' یعنی وہ لوگ جو بھٹک گئے' جو گم کردہ راہ ہیں' وہ قافلہ جو اپنا صحیح راستہ بھول کر کسی دوسری جانب نکل گیا۔ لفظ ''ضَالّ'' کا ایک دوسری صورت پر بھی اطلاق ہوتا ہے کہ جو شخص ابھی تلاشِ حقیقت میں سرگرداں ہو' اس کے اندر طلبِ ہدایت موجود ہو' لیکن ابھی وہ غور وفکر کے مراحل طے کر رہا ہو۔ ایسے شخص کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہو جاتا ہے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ کے بارے میں بھی سورۃ الضحیٰ میں یہی لفظ استعمال کیا گیا: ﴿وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝﴾ ''(اے نبیؐ!) آپؐ کو پایا آپ کے ربّ نے تلاشِ حقیقت میں سرگرداں تو آپ پر ہدایت کا راستہ کھول دیا''۔ آپؐ میں تلاشِ حقیقت کا جذبہ اس شدت کے ساتھ اُبھرا کہ آپؐ نے غارِ حرا کی خلوت گزینی غور وفکر اور سوچ بچار میں کُلی انہماک کے لیے اختیار فرمائی' لہٰذا پروردگار کی جانب سے پردے اٹھا دیے گئے اور نزولِ وحی کا آغاز ہو گیا۔

الغرض ''ضالّین'' کا لفظ ''مغضوب علیہم'' کی بنسبت بہت ہلکا ہے۔ مغضوب علیہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے شرارتِ نفس کے طفیل محض اپنی خواہشات وشہوات کے اتباع میں حق کو جان بوجھ کر ترک کر دیا اور ضالّین وہ ہیں جو یا تو کسی مغالطے کے باعث راہِ حق سے بھٹک گئے ہیں یا ابھی تلاشِ حق میں سرگرداں ہیں۔ مفسرین کے نزدیک مغضوب علیہم کی سب سے بڑی مثال یہود ہیں' جنہوں نے جو ٹھوکریں

کھائیں وہ کسی اندھیرے کے باعث نہیں کھائیں' بلکہ اُس وقت کھائیں جب سورج نصف النہار پر چمک رہا تھا۔ ان کے پاس اللہ کا کلام موجود تھا' اللہ کی ہدایت موجود تھی' اللہ کی شریعت موجود تھی' لیکن اپنی شرارتِ نفس کے باعث انہوں نے اس میں تحریفات کیں۔ اس کے بجائے کہ اپنے آپ کو اللہ کی منشاء کے مطابق ڈھال لیتے' انہوں نے اللہ کے کلام اور اس کے قانون کو اپنی خواہشات کے رُخ پر ڈھال لیا۔ یعنی وہی رویّہ ہے جو علامہ اقبال کے بقول ہمارے علمائے سُوء نے اختیار کیا کہ: ؎

خود بدلتے نہیں' قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق!

اگرچہ نبی اکرم ﷺ کے خاتم النبیین' اُمت مسلمہ کے آخر الاُمم اور قرآن کے ع ''نوعِ انساں را پیامِ آخریں!'' کے مصداق آخری کتاب ہونے کی برکت سے قرآن کا متن محفوظ و مصئون رہا اور تحریف جو بھی ہوئی صرف ترجمہ اور تفسیر میں ہوئی' جبکہ سابقہ اُمتیں' بالخصوص یہود اس معاملے میں بہت دُور نکل گئے تھے اور ان کے علماء نے تو اللہ کی کتاب میں لفظی تحریف تک بھی کر دی تھی۔ لہٰذا یہ ''مَغۡضُوۡبِ عَلَیۡھِمۡ'' کے زمرے میں شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے متعلق قرآن کہتا ہے: ﴿وَضُرِبَتۡ عَلَیۡہِمُ الذِّلَّۃُ وَالۡمَسۡکَنَۃُ وَبَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ﴾ (البقرۃ:٦١) ''ان پر ذلت اور مسکنت تھوپ دی گئی اور وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹے''۔ اس لیے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے حامل ہونے کے باوجود اپنی شرارتِ نفس کے باعث اس ہدایت سے روگردانی کی اور اپنی خواہشاتِ نفس کا اتباع کیا اور نبی اکرم ﷺ کی دعوت کی مخالفت میں پیش پیش رہے۔

سابقہ اُمم میں سے ''ضالّین'' کی نمایاں مثال نصاریٰ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متبعین ہیں۔ اس لیے کہ محبت اور عقیدت کے غلو میں انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کا مقام اتنا بڑھایا کہ معاذ اللہ انہیں اللہ کا بیٹا قرار دے دیا۔ ساتھ ہی عملی

طور پر انہوں نے رہبانیت کی بدعت اختیار کی جس کے متعلق سورۃ الحدید میں ارشاد ہوا: ﴿وَرَهْبَانِيَّةَ نِ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰـهَا عَلَيْهِمْ﴾ (آیت ۲۷) ''اور رہبانیت کی بدعت خود انہوں نے اختیار کی' ہم نے اسے ان پر لازم نہیں کیا تھا''۔ یہ درحقیقت ایک خلافِ فطرت نظام تھا جو انہوں نے خود اپنی مرضی سے اپنی نیکی کے جذبے میں حدِّ اعتدال سے تجاوز کرتے ہوئے' اپنے اوپر غیر فطری پابندیاں عائد کرتے ہوئے اختیار کرلیا تھا۔ ان میں کچھ لوگ تو ضرور ایسے باہمت نکلے جو اِن پابندیوں کو نباہ گئے' لیکن ان کی اکثریت ان پابندیوں کو نباہ نہ سکی۔ نتیجتاً جو کچھ ہوسکتا تھا وہ ہوا اور راہب خانوں کے تہہ خانوں میں ناجائز اولاد کے قبرستان آباد ہوگئے۔ یہ سارا معاملہ اس لیے ہوا کہ انہوں نے فطرت کے خلاف کام کیا۔ چنانچہ مفسرین کی اکثریت کے نزدیک سورۃ الفاتحہ میں ''مغضوب علیہم'' سے مراد یہود اور ''ضالّین'' سے مراد نصاریٰ ہیں۔ ویسے اس مفہوم کو عام رکھا جائے تب بھی کوئی حرج نہیں ہے' اگرچہ ان کی یہ دو نمایاں مثالیں صد فیصد درست ہیں۔

بہرحال یہ ہے سورۃ الفاتحہ کا وہ تیسرا حصہ جس کا تذکرہ اس حدیثِ قدسی میں بایں الفاظ ہو چکا ہے: هٰذَا لِعَبْدِیْ وَلِعَبْدِیْ مَا سَأَلَ ''یہ میرے بندے کے لیے ہے اور میں نے دیا اپنے بندے کو جو اُس نے طلب کیا''۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ حدیث قدسی اس سورۂ مبارکہ کے تجزیے میں بھی بہت مفید ہے اور اس کی عظمت کو بھی بتمام وکمال اور بحسن وخوبی ظاہر کر رہی ہے۔ یہ فطرتِ انسانی کی وہ ترجمانی ہے کہ اگر واقعتاً یہ الفاظ کسی شخص کی زبان سے گہرے شعور و احساس اور قلب و ذہن کی گہرائیوں سے نکل رہے ہوں تو ان کی تأثیر وہی ہے جو اِس حدیث قدسی میں وارد ہوئی ہے کہ اِدھر بندہ ایک ایک جملہ کہتا ہے اُدھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا جواب ملتا چلا جاتا ہے۔ بقول علامہ اقبال: ؎

اَفلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر
کرتے ہیں خطاب آخر' اٹھتے ہیں حجاب آخر

سورۃ الفاتحہ کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ سورۂ مبارکہ قرآن حکیم کا ایک نہایت خوبصورت اور انتہائی موزوں مقدمہ اور دیباچہ ہے۔ فطرتِ انسانی کی وہ پیاس اور صراطِ مستقیم کی وہ احتیاج جس کی ترجمانی سورۃ الفاتحہ میں کی گئی ہے' اسی کی جانب رہنمائی کے لیے قرآن مجید نازل ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سورۂ مبارکہ کے فوراً بعد وارد ہوتے ہیں یہ الفاظِ مبارکہ: ﴿الٓمّٓ ۝١ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝٢﴾ یعنی یہ ہے وہ کتاب جو ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ یہ کسی فلسفی کے من گھڑت خیالات ونظریات اور ذہن انسانی کی تگ وتاز پر مبنی نہیں ہے۔ یہ ''الحق'' یعنی سراسر حق پر مبنی ہے۔ یہ کتاب ان لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے نازل ہوئی ہے جن میں سیدھے راستے کی طلب اور پیاس موجود ہے۔ گویا یہ ہے اس سورۂ مبارکہ کا پورے قرآن مجید کے ساتھ تعلق۔ مزید برآں مباحثِ ایمان کے ذیل میں اس سورۂ مبارکہ کے مطالعہ سے یہ بات متعین ہو جاتی ہے کہ انسان اپنی عقل اور فطرت کی رہنمائی میں کہاں تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ یہی ہے وہ بات جسے علامہ اقبال نے یوں بیان فرمایا:

عقل گو آستاں سے دُور نہیں
اس کی قسمت میں پر حضور نہیں

عقل یقیناً آستان سے دُور نہیں ہے' اس کی رہنمائی میں انسان بہت کچھ حاصل کر سکتا ہے' لیکن جہاں وہ محتاج ہے وہ درحقیقت وہ ہدایت و رہنمائی ہے جو اسے اپنی زندگی کے گوناگوں اور مختلف پہلوؤں میں ہر ہر لحظہ اور ہر ہر قدم پر عمل کے لیے درکار ہے۔ اس کے لیے وہ ہدایتِ آسمانی کا بالکلیہ محتاج ہے۔ اسی لیے اس کی فطرت پکارتی ہے اور استدعا کرتی ہے: **اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ**۔ اس فطرت کی پکار کا جواب ہے پورا قرآن مجید۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی صراطِ مستقیم کی ہدایت بخشے اور اس پر استقامت عطا فرمائے۔ آمین!

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

مرکزی **انجمن خُدّامُ القرآن** لاہور

کے قیام کا مقصد

# منبعِ ایمان ......اور...... سرچشمۂ یقین

# قرآنِ حکیم

کے **علم وحکمت** کی

وسیع پیمانے ......اور...... اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر واشاعت ہے

تاکہ امتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

**اسلام کی نشاۃِ ثانیہ۔ اور۔ غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی**

کی راہ ہموار ہو سکے

**وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ**

# تنظیمِ اسلامی

مروجہ مفہوم کے اعتبار سے

## نہ کوئی سیاسی جماعت نہ مذہبی فرقہ

بلکہ ایک اصولی

# اسلامی انقلابی جماعت

ہے جو اولاً پاکستان اور بالآخر ساری دنیا میں

# دینِ حق

یعنی اسلام کو غالب یا بالفاظِ دیگر

# نظامِ خلافت

کو قائم کرنے کیلئے کوشاں ہے!

امیر: **حافظ عاکف سعید**